مجلس ادارت

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں سالانہ اسی روپیے فی شمارہ سات روپیے

پاکستان میں سالانہ دو سو روپیے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک بیس پونڈ یا بتیس ڈالر

بحری ڈاک سات پونڈ یا گیارہ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ : حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس۔ ایم۔ کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کراچی

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں :

DARULMUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اگر کسی مہینے کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر میں ضرور پہونچ جانی چاہیے اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافہ کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵ ... ہوگا۔ رقم پیشگی آنی ...

فہرست

مضامین معارف

جلد ۱۶۱

ماہ جنوری ۱۹۹۸ء تا ماہ جون ۱۹۹۸ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست

مضمون نگاران معارف

۱۶۱ ویں جلد

ماہ جنوری ۱۹۹۸ء تا ماہ جون ۱۹۹۸ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۶۱ ماہ رمضان المبارک ۱۴۱۸ھ مطابق ماہ جنوری سنہ ۱۹۹۸ء عدد ۱

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

الیکشن کا زمانہ آتا ہے تو سیاسی پارٹیوں کو مسلمانوں کا غم ستانے لگتا ہے، ان کے دل میں رہ رہ کے مروڑ اٹھتا رہتا ہے اور وہ ان کی ہمدردی کے راگ الاپنے لگتی ہیں، پھر یہی پرانے شکاری مسلمانوں کو اپنے اعتماد میں لینے اور انہیں جھوٹی تسلی دینے کے لیے نئے نئے دام لے آتے ہیں، لوک سبھا کے موجودہ انتخابات کا اعلان ہوا تو ان ہمدردوں کی فہرست میں اس دفعہ ایک پارٹی بھارتیہ جنتا کا بھی اضافہ ہو گیا جو اپنے کو اصلی سیکولر اور مسلمانوں کے سب سے بڑے ہمدرد اور مسیحا کے روپ میں پیش کر رہی ہے، حالانکہ اب سے پہلے تک اس کی مسلم دشمنی مشہور تھی اور وہ اس پر علانیہ فخر کرتی تھی اور دوسری پارٹیوں کو مسلمانوں کی منہ بھرائی کا طعنہ بھی دیتی تھی، اگر اس کے پچھلے تمام جارحانہ ریکارڈ اور خود کو اصولی پارٹی کہنے کے باوجود علی الاعلان اس نے جو بے اصولیاں اور بدعنوانیاں کی ہیں ان سب سے صرف نظر کر لیا جائے اور بابری مسجد کے انہدام سے اب تک صرف اسی کے تعلق سے بی جے پی کی کارستانیاں دیکھی جائیں تو اس کے سیکولر اور مسلمانوں کے ہمدرد ہونے کا بھانڈا پھوٹ جائے۔

بھارتیہ جنتا پارٹی نے ہر حال میں مرکز میں برسر اقتدار آنے کا جو تہیہ کیا ہے، یہ دراصل اسی کی ایک کرشمہ ہے، اس کا یہ منصوبہ اس لیے آسان ہو گیا ہے کہ جو سیکولر پارٹیاں اسے اقتدار سے دور رکھنے کا دعویٰ کر رہی ہیں وہ نہایت منتشر ہیں اور ان میں سخت نفرت اور دوری ہے، ظاہر ہے جب ان میں کوئی تال میل نہیں تو وہ نہ سیکولر ووٹوں کو منقسم ہونے سے بچا سکتی ہیں اور نہ بھارتیہ جنتا پارٹی کو اقتدار سے دور رکھ سکتی ہیں، جب کہ اس انتخاب میں وہ مسلمانوں کی خاص ہمدرد بن کر ان کے ووٹ حاصل کرنے یا بٹوارہ کر کے انہیں بیکار اور ضایع کر دینے پر تلی ہوئی ہے، اس کی خوش قسمتی سے مسلمانوں کے ایک طبقہ پر چاہے وہ کتنا ہی بے اثر اور قلیل ہو اس کا جادو بھی چل گیا ہے اور وہ اپنی سادہ لوحی یا لالچ یا متوقع ذاتی مفاد کے لیے ہونے والے وزیر اعظم کی ان باتوں پر یقین کر بیٹھا ہے کہ بی۔ جے۔ پی اگر اقتدار میں آئی تو

انکی تعلیمی پسماندگی اور روزگار کے مسائل حل کر دے گی۔ وہ اس کا خوف دل سے نکال دیں اور اسے اقتدار میں آنے کا ایک موقع دیں، دوسری طرف وہ ایڈوانی جی کی دعوت کی وجہ سے بھی نرم پڑا ہے کہ وہ اپنے مسائل پر براہ راست بات چیت کریں اور مخالفوں کی عینک سے اسے دیکھنے کے بجائے یہ دیکھیں کہ جن ریاستوں میں بی۔ جے۔ پی کی حکمرانی ہے ان میں ان کو کوئی تکلیف نہیں ہے۔

ایڈوانی جی نے اپنے اسی بیان میں بی۔ جے۔ پی کے اصلی معنوں میں سیکولر ہونے پر بڑا زور دیا ہے حالانکہ وہ آر ایس۔ ایس جیسی فرقہ پرست بلکہ فاشسٹ جماعت کا سیاسی بازو اور اصلاً اسی کے فیصلوں کی پابند ہے۔ کیا ایسی جماعت سیکولر ہو سکتی ہے جس کا مقصد ہی ہندوتوا کا احیا ہو اور جو صراحتاً اس کو متعدد بار کہہ چکی ہو کہ وہ بابری مسجد کی جگہ شاندار مندر بنانے کے لیے عدالت کے فیصلہ کا انتظار کیے بغیر خود قانون بنا کر مندر تعمیر کرنے کی اجازت حاصل کرے گی، مسلم پرسنل لا کو ختم کرنے اور مشترکہ سول کوڈ نافذ کرنے کے لیے دستور تبدیل کر دے گی وغیرہ۔ کیا کسی سیکولر پارٹی کا یہ شیوہ ہو سکتا ہے کہ اس کی حکمرانی میں اس کے سب سے بڑے سربراہ کی موجودگی میں اس کی شہ پر چھن بھر میں پانچ سو برس پرانی مسجد ڈھا کر اسی جگہ پوجا پاٹ کے لیے عارضی مندر تعمیر کرا دے، اس ڈھٹائی، خراب ریکارڈ اور سیاہ کرتوتوں کے باوجود کچھ نام نہاد مسلم لیڈر اور مسجدوں کے دو رکعت کے ائمہ بی جے پی کی پاکیِ داماں کی شہادت دیں تو ان کے بارے میں اس کے سوا اور کیا کہا جائے کہ ؎

ہم بڑی بات سمجھتے تھے یہ میخانے میں
اک جام کی قیمت بھی نہ نکلا ایماں اپنا

ایڈوانی جی کہتے ہیں بی۔ جے۔ پی کی لہر چل رہی ہے وہ مرکز میں برسر اقتدار آ رہی ہے، مسلمان اس سے بات کرنے کا موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ اگر واقعی ایسا ہے تو مسلمانوں کی خوشامد یا انکو بہلانا، پھسلانا اور دھمکانا کس لیے ہے؟ کیوں ان کو بات چیت کی دعوت دی جا رہی ہے اور ان سے ایک چانس کس لیے مانگا جا رہا ہے، آپ اپنا شوق حکمرانی پورا کریں اور مسلمانوں کو ان کے خدا کے حوالے

کریں وہ صرف اسی سے خائف ہیں، آپ کے برسرِ اقتدار آنے سے کیوں خائف ہوں گے، اقتدار آنی جانی چیز ہے تؤتی الملک من تشاء وتنزع الملک ممن تشاء۔ آزادی کے بعد سے انہوں نے جو مصائب جھیلے ہیں ان کی وجہ سے ان کا حال یہ ہوگیا ہے کہ؎

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج   مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں

اگر واقعی بی۔ جے۔ پی سیکولر ہے تو اس کے ثبوت کے لیے جعفر و صادق قسم کے لوگوں کی گواہی پیش کرنے کے بجائے مسلمانوں کے سوادِ اعظم کے سامنے اس کا عملی نمونہ پیش کرنا چاہیے اور ہتھ نکال کر فرقہ وارانہ جنون بھڑکانے کے بجائے بابری مسجد کے انہدام کے لیے ان سے معافی مانگنا اور اس کا اعلان کرنا چاہیے کہ عارضی مندر کی مورتیاں ہٹا کر وہاں دوبارہ مسلمان مسجد تعمیر کرلیں اور آر۔ ایس۔ ایس اور وشو ہندو پریشد سے بھی اس کی یقین دہانی کرائیں کہ وہ کاشی اور متھرا پر اپنے جھوٹے دعوے سے دستبردار ہوجائیں ع گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں

بی۔ جے۔ پی کے فرقہ پرست ہونے کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ اس نے اسی شخص کو دوبارہ یو۔ پی کا وزیر اعلیٰ بنایا ہے جس نے پہلی مرتبہ بابری مسجد مسمار کرائی تھی، جس کو اس جرم کی عدالت نے سزا دی تھی۔ لالو پرشاد یادو کی برطرفی کے لیے سب سے زیادہ بی۔ جے۔ پی نے شور مچایا تھا لیکن جے للیتا سے سمجھوتہ کرنے میں اسے ذرا بھی تامل نہ ہوا۔ اس دفعہ یو۔ پی کے وزیر اعلیٰ نے وندے ماترم کا شاخسانہ چھوڑا ہے جو ایک مشرکانہ اور مسلم دشمنی پر مبنی گانا ہے۔ اٹل بہاری باجپئی مسلمانوں کی تعلیمی و اقتصادی پس ماندگی دور کرنے کے لیے وزیر اعظم بننے کے لیے بے چین ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمانوں کو سب سے زیادہ اپنا ایمان وعقیدہ عزیز ہے۔ اگر ان کی جماعت سکولر ہے تو اسے اتر پردیش حکومت کو وندے ماترم سے متعلق حکم واپس لینے کے لیے مجبور کرنا چاہیے، اس حکم پر عمل کرکے کوئی مسلمان اپنے ایمان وعقیدہ پر قائم نہیں رہ سکتا۔

مقالات

عالمِ نباتات میں ربوبیت کے جلوے
اور
بعض لاینحل حیاتیاتی معمے

از مولانا محمد شہاب الدین ندوی، بنگلور

اللہ تعالیٰ سارے جہاں کا رب (کارساز) ہے اور اس کی ربوبیت اس عالم رنگ و بو اور اس کے تمام مظاہر کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ ربوبیت سے مراد خالق کائنات کی وہ کارگزاریاں یا کارسازیاں ہیں جو مخلوق پروری کے طور پر عالم مظاہر میں جاری وساری ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس طرح عالم نباتات وحیوانات کا رب ہے اسی طرح وہ عالم جمادات وسماوات کا بھی رب ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں صراحتاً مذکور ہے:

وَهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ (انعام: ۱۶۴)	وہ ہر چیز کا رب ہے۔
رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ۔ (صافات: ۵)	وہ آسمانوں، زمین اور ان دونوں کے درمیان (تمام) مظاہر اور مشرقوں (سورج کے مختلف مقاماتِ طلوع) کا بھی رب ہے۔

غرض اللہ تعالیٰ کی ربوبیت پوری مادی کائنات پر محیط ہے اور یہاں کی کوئی بھی چیز یا کوئی بھی مظہر فطرت آزاد نہیں، بلکہ وہ مادی قوانین میں جکڑا ہوا ہے، چاہے وہ ایک

ننھا سا جوہر (ایٹم) ہو یا کرۂ سماوی، کوئی پیڑ پودا ہو یا حیوانِ مطلق، مادہ سے متعلق ہو یا انرجی سے، حرکت سے تعلق رکھتا ہو یا سکون سے۔

ربوبیت کے چار عناصر جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ربوبیت مخلوق پروری کے سلسلے میں رب کی کارگزاریوں کا نام ہے اور اس کے یہ چار عناصر ہیں: (۱) تخلیق یعنی اشیاء کو عدم سے وجود میں لانا۔ (۲) تسویہ یعنی مادی اشیاء کا نظام جسمانی درست اور موزوں بنانا۔ (۳) تقدیر یعنی تمام مخلوقات کے لیے طبیعی ضوابط مقرر کرنا (۴) ہدایت یعنی ہر مخلوق کو اس کے مخصوص طبیعی ضابطہ کے مطابق چلنے کی توفیق بخشنا۔ چنانچہ ربوبیت کی یہ چاروں خصوصیات حسبِ ذیل آیات میں بیان کی گئی ہیں:

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى۔ الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّى۔ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَى (اعلیٰ ۱-۳)

اپنے رب برتر کے گن گاؤ جس نے (اس کائنات کی تمام چیزوں کو) پیدا کیا، پھر (ہر چیز کا جسمانی نظام) درست کیا۔ وہ جس نے (ہر چیز کا ایک مخصوص طبیعی ضابطہ) مقرر کیا پھر (ہر ایک کو اس ضابطہ کے مطابق چلنے کی) توفیق بخشی۔

یہ بڑی ہی جامع آیات ہیں جو حد درجہ مجمل ہونے کے باوجود اپنے معنی و مفہوم میں بالکل واضح ہیں۔ یہ چار ربانی کلیات ہیں جو پوری کائنات اور اس کی تمام چیزوں کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس جہانِ آب و خاک کے تمام مظاہر خدائی ربوبیت کے نقوش ہیں اور مادی اشیاء کو علی وجہ البصیرت سمجھنے کے لیے ان چار نقطہ ہائے نظر سے

مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے جو قرآنی زاویہ نظر ہے۔ اس کے نتیجے میں خلاقِ عالم کی صنعت و کاریگری کے نقوش ہمارے سامنے آتے ہیں اور اس کی صحیح معرفت حاصل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی صانع کی عظمت اس کی مصنوعات کی جانچ پڑتال کے بعد ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

مطالعۂ ربوبیت کی اہمیت اللہ تعالیٰ کی عجیب و غریب صنعت و کاریگری کا صحیح حال ہم کو حیوانات و نباتات کی دنیا میں ملتا ہے۔ جو ایک عامی اور عالم دونوں کے لیے بصیرت کا سامان فراہم کرتا ہے۔ یعنی ایک عالم قدرتِ خداوندی کی صناعیوں اور گلکاریوں کے مشاہدے سے جس طرح حیران و ششدر ہو جاتا ہے اسی طرح ایک عامی بھی دنیائے حیات کی رنگارنگیوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، خواہ اس کا مطالعہ کتنا ہی سطحی کیوں نہ ہو۔ حیوانات و نباتات کے اختلافات اتنے گوناگوں ہیں کہ ان کے ملاحظہ و مشاہدہ سے انسانی عقل بالکل چکرا جاتی ہے اور ایک کرشمہ ساز ہستی کا وجود تسلیم کیے بغیر ان انواع و اقسام کی مخلوقات اور ان میں کارفرما حیران کن نظاموں کی توجیہ عقلی اعتبار سے ممکن نظر نہیں آتی۔ چنانچہ انواعِ حیات کا منظم مطالعہ آج جس علم کے تحت کیا جاتا ہے اسے حیاتیات یا بایالوجی کہتے ہیں اور یہ ایک اہم سائنسی علم ہے۔ اس علم کے تحت حیوانات و نباتات کا مطالعہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کو علی وجہ البصیرت سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

اس علم کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ قرآن مجید کی جو اولین آیات نازل ہوئیں وہ مخلوقاتِ الٰہی اور خاص کر تخلیقِ انسان کے مطالعہ و مشاہدہ سے متعلق ہیں جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ (علق ۱-۲)

پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے (تمام چیزوں کو) پیدا کیا۔ اس نے

انسان کی تخلیق (جونک نما کیڑے سے کی۔

چنانچہ اس پہلی وحی میں رب کا اولین تعارف خالق کی حیثیت سے کراتے ہوئے مخلوقاتِ الٰہی کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔ یعنی خدا کی ربوبیت کی حقیقت اگر سمجھنا مقصود ہے تو پھر اس کی مخلوقات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ ایک صانع کی عظمت و برتری کا صحیح حال اس کی مصنوعات کے جائزہ کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا، نیز مشاہدہ سے جو علم و عرفان حاصل ہوتا ہے اس سے ایمان میں پختگی آتی ہے اور ایک پختہ ایمان والا شخص فکر و نظر کی وادیوں میں بھٹک نہیں سکتا اور الحاد و لادینیت کے تھپیڑے اس کے پائے ثبات کو متزلزل نہیں کر سکتے۔ انہی اغراض و مقاصد کی خاطر قرآن حکیم میں جابجا تخلیقاتِ الٰہی اور ان کے نظاموں کا گہری نظر سے مطالعہ و مشاہدہ کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔

نباتاتی مظاہر میں دلائل ربوبیت

اس وقت میرا موضوعِ بحث چونکہ نباتات ہے اس لیے میں قرآنی نقطۂ نظر سے نباتات کے بعض پہلوؤں کو اجاگر کروں گا، جن کے ملاحظہ سے خدائے تعالیٰ کی ربوبیت کے حیرت انگیز نقوش سامنے آتے ہیں اور اس کی بے مثال قدرت، خلاقیت، حکمتِ تخلیق، مخلوق پروری اور اس کی رحمانیت یعنی مخلوقات پر بے انتہا شفقت و مہربانی کے جلوے نظر آتے ہیں، جو اہلِ ایمان کے لیے ایمان افروز اور منکرینِ حق کے لیے سبق آموز ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کی صراحت کے مطابق اس عالم آب و گل کی ہر چیز میں خدا کے وجود، اس کی وحدانیت اور اس کی خلاقیت و ربوبیت کے نشانات و دلائل موجود ہیں جن سے الحاد و مادیت کا رد اور خدا پرستی کا اثبات ہوتا ہے۔

إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ۔

(یونس: ۶)

رات اور دن کے ہیر پھیر میں اور جو کچھ اللہ نے زمین اور اجرام سماوی میں پیدا کر رکھا ہے ان (تمام مظاہر) میں ڈرنے والوں کے لیے (وجود خداوندی کی) نشانیاں موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اور اس کی مخلوق پروری کا ایک مظہر تم وہ قسم با قسم کے نباتات (پیڑ پودے) ہیں جن کو اس نے دھرتی کے سینے پر پھیلا رکھا ہے اور ان نباتات کے مختلف مظاہر اور ان کی خصوصیات پر غور و خوض کرنے والوں کے لیے قدرت خداوندی کی نشانیاں قوانین قدرت کے روپ میں، رکھ دی گئی ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری ہے:

هُوَ الَّذِيْٓ أَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ۔ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْأَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ إِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَآيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ۔

(نحل: ۱۰-۱۱)

وہی ہے جس نے بلندی سے تمہارے لیے پانی برسایا، جس میں سے کچھ تمہارے پینے کے لیے ہے اور کچھ سے درخت اگتے ہیں جن میں تم (اپنے جانوروں کو) چراتے ہو اور اسی پانی سے وہ تمہارے لیے (طرح طرح کی) کھیتیاں زیتون، کھجور، انگور اور ہر قسم کے پھل اگاتا ہے۔ غور کرنے والوں کے لیے یقیناً اس باب میں (وجود خداوندی اور اس کی ربوبیت کی) ایک بڑی نشانی موجود ہے۔

عجائبات قدرت اور قرآن کا اعجاز

واقعہ یہ ہے کہ نباتاتی زندگی کے بہت سے طبیعی و حیاتیاتی مطالعے ہیں جن کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لینے کے لیے سائنسی علوم سے واقفیت ضروری ہے، چنانچہ نباتات کا منظم مطالعہ جس علم کے تحت کیا جاتا ہے اسے علم النبات یا نباتیات (باٹنی) کہا جاتا ہے، جو حیاتیات (بیالوجی) کی ایک شاخ ہے اور اس علم کی رو سے نباتاتی اعمال و انفعال اور ان کے خصائص سے متعلق بے شمار اسرار و حقائق سامنے آچکے ہیں جو "دلائل ربوبیت" میں شمار کیے جاسکتے ہیں اور انہیں "عجائبات قدرت" کا بھی نام دیا جاسکتا ہے۔ ان کے ملاحظہ کے لیے نگاہ عبرت بیں کی ضرورت ہے۔ ورنہ کور باطن کے لیے یہ سارے اسرار و حقائق بالکل بے معنی یا "اتفاقات" کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہیں۔

بہرحال قرآن حکیم میں نباتاتی مظاہر اور ان کے اسرار و حقائق کے خداپرستانہ نقطۂ نظر سے مطالعہ و جائزہ کی غرض سے چند اصول و کلیات ایسے مذکور ہیں جن کی روشنی میں اگر ان مظاہر پر سائنسی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو ربانی اصول و کلیات کی صداقت واضح ہوجاتی ہے اور یہ اصول و کلیات اتنے جامع ہیں کہ ان کو چودہ سو سال پہلے پیش کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ یہ اصول وہی پیش کرسکتا ہے جس کا علم تمام اشیائے عالم اور ان کی اندرونی مشنری کا احاطہ کیے ہوئے ہو اور ان کے ایک ایک کل پرزے اور اس کی کارکردگی سے بخوبی واقف ہو۔ غرض یہ اصول نباتاتی اسرار و معارف کے سربمہر خزانوں کی چابیوں کی حیثیت رکھتے ہیں جو علوم و معارف کے بند دروازوں کو کھول دیتے ہیں۔

ان ابدی صداقتوں کے ملاحظہ سے قرآن عظیم کا ایک نیا اعجاز سامنے آتا ہے کہ وہ محض اپنی فصاحت و بلاغت ہی کے لحاظ سے معجزہ نہیں بلکہ اپنے علوم و معارف اور ان کی

جامعیت کے لحاظ سے بھی ایک ناقابل فراموش معجزہ ہے اور اس کی نظیر پیش کرنے سے پورا انسانی لٹریچر عاجز و بے بس ہے اور پھر اس سلسلے میں ایک دوسری عظیم حقیقت یہ ہے کہ وہ محض ایک جامع و مانع کلام ہی نہیں بلکہ وہ اٹل علمی صداقتوں کا بھی حامل ہے۔ یعنی اس کے دعوے ایسے اٹل علمی حقائق پر مبنی ہوتے ہیں جن میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوسکتی، خواہ انسانی علوم کتنی ہی ترقی کیوں نہ کرلیں، بلکہ وہ علوم و فنون کے مغز اور لب لباب کو، جو صدیوں کے غور و فکر اور تجربات کا نتیجہ ہوتا ہے، قبل از وقت علمی صداقتوں کے روپ میں پیش کرتا ہے اور وہ بھی اس انداز میں کہ ان کے ذریعہ مادہ پرستوں کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنا مقصود ہو۔ گویا کہ یہ حقائق فکر و نظر کے بند دریچوں پر دستک دینے والے ہیں۔

بہرحال اس موقع پر علم النبات کی روشنی میں بعض قرآنی حقائق یا اس کی ابدی صداقتوں کا ایک مختصر جائزہ لینا مقصود ہے، جن سے خدائے تعالیٰ کی خلاقیت اور اس کی قدرت و ربوبیت ثابت ہوتی ہے اور مادیت کا رد و ابطال ہوتا ہے۔

مردہ عناصر سے زندگی کون برآمد کرتا ہے؟

اس سلسلے میں سب سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ طویل سائنسی تحقیقات و تجربات کی روشنی میں یہ حقیقت پوری طرح ثابت ہوچکی ہے کہ زندگی کا ظہور مردہ عناصر یا غیر جاندار چیز سے نہیں ہوسکتا۔ بلکہ "زندگی" صرف زندہ اشیا ہی سے وجود میں آسکتی ہے۔ چنانچہ اس باب میں مشہور فرنچ سائنسداں پاسچر کے تجربات دنیائے سائنس میں ایک اٹل صداقت کے طور پر مسلم ہیں۔ واضح رہے زندگی کی اکائی ایک خلیہ (سیل) ہے، جس میں ایک لیسدار اور متحرک مادہ بھرا رہتا ہے۔ اسے اصطلاح میں پروٹوپلازم کہا جاتا ہے اور یہ مادہ حیوانات و نباتات دونوں میں مشترکہ طور پر پایا

جاتا ہے۔ یعنی حیوانات و نباتات دونوں کے اجسام ننھے ننھے خانوں کا مجموعہ ہوتے ہیں جن کو خلیات (CELLS) کہا جاتا ہے اور یہ پروٹوپلازم سے بھرے ہوتے ہیں۔ پروٹوپلازم ذی روح مادہ ہے اور اسی میں زندگی کی تمام "سرگرمیاں" جاری رہتی ہیں اور تماشائے ربوبیت کا ظہور ہوتا ہے۔

مگر پوری دنیائے سائنس حیران ہے کہ مردہ عناصر سے پروٹوپلازم کس طرح وجود میں آگیا؟ از خود حیات کا نظریہ رکھنے والے اس معمہ کو حل نہیں کر سکے اور نہ کر سکتے ہیں لہذا بعض سائنس دانوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ زندگی کا ظہور ہمارے کرۂ ارض پر نہیں ہوا بلکہ کسی دوسرے سیارے پر ہوا ہوگا اور وہاں سے وہ بعض شہابوں کے کندھوں پر سوار ہو کر ہماری زمین پر آئی ہوگی، مگر اس خیال آرائی سے جو اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہے یہ معمہ اور بھی زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے کہ خود دوسرے سیارے پر زندگی کا ظہور آخر کس طرح ہوا ہوگا؟ لہذا سائنسی نقطۂ نظر سے یہ ایک ایسا رازِ سربستہ ہے جس کی عقدہ کشائی سے عقل انسانی عاجز و بے بس نظر آتی ہے۔ اب لامحالہ ایک خلاق ہستی کا وجود تسلیم کرنا پڑتا ہے جو ایک "رب عظیم" کی حیثیت سے اس عالم آب و خاک پر حکمرانی کر رہی ہے، یہی خدا ہے، چنانچہ اس عظیم حقیقت کا انکشاف قرآن عظیم میں اس طرح کیا گیا ہے، جو ذہن انسانی کو جھنجوڑنے اور اس کی گرہوں کو کھولنے والی ہے:

إِنَّ اللَّهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوَىٰ	اللہ (وہ ہے جو زمین میں بوئے گئے)
يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ	دانے اور گٹھلی کو پھاڑ دیتا ہے، وہ
الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ فَأَنَّىٰ	بے جان چیز (عناصر) سے جاندار چیز
تُؤْفَكُونَ (انعام: ۹۵)	(پروٹوپلازم) اور جاندار چیز سے

بے جان چیز (جیسے پرندوں کے انڈے)
برآمد کرتا ہے، یہی ہے اللہ، تو تم کہاں
بہکے جا رہے ہو؟

اس اصول کو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اور مختلف اسالیب میں دہرایا گیا ہے۔

معمہ ہائے حیات ظاہر ہے کہ مردہ عناصر یا چند بے جان ذرات (جیسے آکسیجن، کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، کیلشیم، فاسفورس، کلورین، سلفر، پوٹاشیم اور سوڈیم وغیرہ جو پروٹوپلازم کے اندر پائے جانے والے عناصر ہیں) ان کے باہمی ملاپ سے زندگی پیدا کرنا ہی ایک معجزۂ ربوبیت ہے، مگر اس سے بھی بڑا معجزہ یہ ہے کہ خلاق عالم بار بار اس عمل کا اعادہ کر کے عقل انسانی کو مبہوت و ششدر کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ زندہ اشیاء (حیوانات و نباتات) سے مردہ اشیاء جیسے گٹھلی، بیج اور انڈے پیدا کر کے پھر ان مردہ چیزوں کے اندر زندگی ڈال دیتا ہے۔ کسی پرندے کے انڈے یا کسی درخت کے ایک ننھے سے بیج کے اندر سے پھر ہو بہو وہی پرندہ یا ہو بہو وہی درخت نکال کر اپنی جادوگری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ نیز اسی طرح دودھ پلانے والے جانور اپنی ہی نوع کے بچوں کو جنم دیتے ہیں اور یہ عمل گویا کہ ایک زندہ چیز سے دوسری زندہ چیز کو وجود میں لانا ہے جو اور بھی زیادہ پراسرار ہے۔ جیسا کہ اس کا حال علم جنین کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔

سائنسی نقطۂ نظر سے کہا جاتا ہے کہ حیوانات و نباتات کے خلیوں میں جین اور کروموسوم نامی ایسے اجزا پائے جاتے ہیں جو نوعی اور وراثتی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ انہی کے ذریعہ ایک نسل کی خصوصیات دوسری نسل میں منتقل ہوتی ہیں مگر اس نظریہ سے کسی جسم کے خود کارانہ عمل کی توجیہ نہیں ہوتی کہ کسی جسم کے اعضاء یا کسی درخت

جاتا ہے۔ یعنی حیوانات و نباتات دونوں کے اجسام ننھے ننھے خانوں کا مجموعہ ہوتے ہیں جن کو خلیات (CELLS) کہا جاتا ہے اور یہ پروٹوپلازم سے بھرے ہوتے ہیں۔ پروٹوپلازم ذی روح مادہ ہے اور اسی میں زندگی کی تمام "سرگرمیاں" جاری رہتی ہیں اور تماشائے ربوبیت کا ظہور ہوتا ہے۔

مگر پوری دنیائے سائنس حیران ہے کہ مردہ عناصر سے پروٹوپلازم کس طرح وجود میں آگیا؟ از خود حیات کا نظریہ رکھنے والے اس معمہ کو حل نہیں کر سکے اور نہ کر سکتے ہیں لہذا بعض سائنس دانوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ زندگی کا ظہور ہمارے کرۂ ارض پر نہیں ہوا بلکہ کسی دوسرے سیارے پر ہوا ہوگا اور وہاں سے وہ بعض شہابوں کے کندھوں پر سوار ہوکر ہماری زمین پر آئی ہوگی، مگر اس خیال آرائی سے جو اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہے یہ معمہ اور بھی زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے کہ خود دوسرے سیارے پر زندگی کا ظہور آخر کس طرح ہوا ہوگا؟ لہذا سائنسی نقطۂ نظر سے یہ ایک ایسا رازِ سربستہ ہے جس کی عقدہ کشائی سے عقل انسانی عاجز و بے بس نظر آتی ہے۔ اب لامحالہ ایک خلاق ہستی کا وجود تسلیم کرنا پڑتا ہے جو ایک "ربِ عظیم" کی حیثیت سے اس عالمِ آب و خاک پر حکمرانی کر رہی ہے، یہی خدا ہے، چنانچہ اس عظیم حقیقت کا انکشاف قرآنِ عظیم میں اس طرح کیا گیا ہے، جو ذہن انسانی کو جھنجوڑنے اور اس کی گرہوں کو کھولنے والی ہے:

إِنَّ اللّٰہَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰیؕ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّؕ ذٰلِكُمُ اللّٰہُ فَأَنّٰی تُؤْفَكُونَ (انعام: ۹۵)

(اللہ وہ ہے جو زمین میں بوئے گئے) دانے اور گٹھلی کو پھاڑ دیتا ہے، وہ بے جان چیز (عناصر) سے جاندار چیز (پروٹوپلازم) اور جاندار چیز سے

بے جان چیز (جیسے پرندوں کے انڈے) برآمد کرتا ہے، یہی ہے اللہ، تو تم کہاں بہکے جا رہے ہو؟

اس اصول کو قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اور مختلف اسالیب میں دہرایا گیا ہے۔

معمہائے حیات

ظاہر ہے کہ مردہ عناصر یا چند بے جان ذرات (جیسے آکسیجن، کاربن، ہائیڈروجن، نائٹروجن، کیلشیم، فاسفورس، کلورین، سلفر، پوٹاشیم اور سوڈیم وغیرہ جو پروٹوپلازم کے اندر پائے جانے والے عناصر ہیں) ان کے باہمی ملاپ سے زندگی پیدا کرنا ہی ایک معجزۂ ربوبیت ہے، مگر اس سے بھی بڑا معجزہ یہ ہے کہ خلاق عالم بار بار اس عمل کا اعادہ کر کے عقل انسانی کو مبہوت و ششدر کر دیتا ہے۔ چنانچہ وہ زندہ اشیاء (حیوانات و نباتات) سے مردہ اشیاء جیسے گٹھلی، بیج اور انڈے پیدا کر کے پھر ان مردہ چیزوں کے اندر زندگی ڈال دیتا ہے۔ کسی پرندے کے انڈے یا کسی درخت کے ایک ننھے سے بیج کے اندر سے پھر ہوبہو وہی پرندہ یا ہوبہو وہی درخت نکال کر اپنی جادوگری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ نیز اسی طرح دودھ پلانے والے جانور اپنی ہی نوع کے بچوں کو جنم دیتے ہیں اور یہ عمل گویا کہ ایک زندہ چیز سے دوسری زندہ چیز کو وجود میں لانا ہے جو اور بھی زیادہ پُراسرار ہے۔ جیسا کہ اس کا حال علم جنین کے مطالعہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔

سائنسی نقطۂ نظر سے کہا جاتا ہے کہ حیوانات و نباتات کے خلیوں میں جین اور کروموسوم نامی ایسے اجزا پائے جاتے ہیں جو نوعی اور وراثتی خصوصیات کے حامل ہوتے ہیں۔ انہی کے ذریعہ ایک نسل کی خصوصیات دوسری نسل میں منتقل ہوتی ہیں مگر اس نظریہ سے کسی جسم کے خودکارانہ عمل کی توجیہ نہیں ہوتی کہ کسی جسم کے اعضاء یا کسی درخت

کی ڈالیاں، پتے، پھول اور پھل سب کے سب اپنی نوعی خصوصیات کو لے کر آپ سے آپ کس طرح نمودار ہو جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ اس کی پتیوں کی بناوٹ میں نہ کوئی فرق آتا ہے اور نہ اس کے پھولوں اور پھلوں میں۔ نہ رنگوں میں کوئی تبدیلی ہوتی ہے اور نہ اس کے خواص میں۔ نہ اس کے اجزا اور عناصر میں کوئی اختلاف رونما ہوتا ہے، نہ اس کے ذائقہ میں کوئی خلل واقع ہوتا ہے، گویا کہ کوئی اس کے اندر بیٹھا ہوا ہے اور ہر ایک کو یہ حکم دے رہا ہے کہ تم ایسا کرو اور تم ایسا کرو، چنانچہ ڈالیوں کو حکم ہے کہ تم اتنی بلندی تک جاؤ اور اس قدر پھیلو۔ پتیوں کو حکم ہے کہ تم فلاں فلاں شکل اختیار کرو اور فلاں فلاں خدمات انجام دو۔ نسیجوں کو حکم ہے کہ تم فلاں فلاں سمت میں اپنی پیش قدمی جاری رکھو اور فلاں فلاں اعضا بناؤ۔ پھولوں اور پھلوں کو حکم ہے کہ تم اتنے اتنے عناصر لے لو اور اس اس طرح کا رنگ و ذائقہ اختیار کرو۔ غرض ہر پیڑ پودا بالکل اسی انداز میں نشو و نما پاتا ہے جو اسکے "پیشرووں" کی خصوصیات کے مطابق ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ ایک طلسم ہوشربا سے کسی بھی طرح کم دکھائی نہیں دیتا۔ چنانچہ اس سلسلے میں خود ایک سائنسداں اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے کہ: "یہ کہنا کہ جسم کی ساخت کو جینز کے ذریعہ کنٹرول کیا جاتا ہے اور پھر سائنٹفک نقطۂ نظر سے اس کی تشریح کرنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہے بہ نسبت یہ کہنے کے کہ جسم کو خدا کے ذریعہ کنٹرول کیا جاتا ہے"۔

To say that the body form is controlled by the genes is hardly illuminating scientifically than to say that it is controlled by God . (The Encyclopeadia of Ignorance . P. 252 Oxford. 1978)

واقعہ یہ ہے کہ جین اور کروموسوم کی دنیا انتہائی پیچیدہ ہے جسے سائنس داں اب تک پوری طرح سمجھ نہیں پائے ہیں۔ چنانچہ جین کی تشکیل جس مادہ سے ہوئی ہے اسے ڈی این اے (DNA) کہا جاتا ہے اور یہ چار قسم کے ہوتے ہیں مگر ان مادوں کے اجتماع کی صحیح کیفیت اب تک نامعلوم ہے۔ جیسا کہ ایک مشہور مصنف تحریر کرتا ہے:

It wasstillnotknown,however,exactlyhowthese four kinds of building units are joined to form DNA (Human Genetics, P. 209 , by Rothwell . 1978)

ایک اور مصنف لکھتا ہے کہ بغیر ڈی این اے کے زندہ اجسام دوبارہ وجود میں نہیں آسکتے اور زندگی شروع نہیں ہو سکتی۔ تو اب سوال یہ ہے کہ ڈی این اے کس طرح بنا اور زندگی کیسے وجود میں آئی؟ تو اس سوال کے جواب میں سائنس ہمیشہ ہچکچاتی ہے کیونکہ اصل زندگی کا رشتہ مذہبی عقائد کے ساتھ اس سے کہیں زیادہ مضبوطی کے ساتھ بندھا ہوا ہے جتنا کہ اصل ارض یا اصل کائنات کا رشتہ۔ لہذا اس سلسلے میں اب تک جھجک آمیز اور معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا جاتا ہے:

Without DNA , living organisms could not reproduce , and life as we know it could not have started . All the substances of living matter - enzymes and all the others , whose production is catalysed by enzymes- depend in the last analysis on DNA . How, then , did DNA , and life , start ? This is a question that science has always hesitated to ask , because the origin of life has been bound up with religious beliefs even more strongly than has the origin of earth and universe . It is still dealt with only hesitantly and apologetically . (Asimo's Guide to science , Vol. 2 , PP. 172 - 173 , 1978) .

عملِ تخلیق کون دہراتا ہے

بہر حال مادۂ حیات، جین اور کروموسوم سے متعلق یہ تمام سرگرمیاں خلیوں (CELLS) میں واقع ہوتی ہیں اور ہر خلیہ اپنی جگہ پر ایک مکمل فیکٹری کی حیثیت رکھتا ہے جو صرف خوردبین سے دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر انسان اب تک اس ننھی سی چیز کی حقیقت سمجھنے اور اس کے اسرار کا احاطہ کرنے سے قاصر نظر آتا ہے۔ زندگی کا آغاز کس طرح ہوا؟ ایک پُراسرار طریقے سے جس کی حقیقت نامعلوم ہے اور یہ عمل نظامِ فطرت میں مسلسل جاری ہے۔ یعنی حیوانات و نباتات کی دنیا میں یہ عمل برابر دہرایا جا رہا ہے۔ چنانچہ ہر نوع اپنی ہی نوع کو جنم دیتی ہے۔ مگر کسی نوع کا دوبارہ جنم اتنا ہی حیرتناک ہے جتنا کہ اس کے ابتدائی جنم کی گتھیوں کو سلجھانا۔ اب پوری دنیائے سائنس دم بخود ہے کہ یہ "خودکارانہ عمل" آخر کس طرح انجام پا رہا ہے؟ مثال کے طور پر ایک پودا جو ایک ننھے سے بیج سے نکلتا ہے وہ بالکل اپنے نوعی نقشے کے مطابق برآمد ہوتا ہے۔ اس کی ڈالیاں، شاخیں، غنچے، پتیاں، پھول اور پھل سب کچھ اس کی "آبائی" خصوصیت کے مطابق ہوتا ہے گویا کہ کسی ماہر کاریگر نے اسے چھیل چھیل کر اور تراش تراش کر بنایا ہو۔ حتیٰ کہ اس کے اجزا و عناصر اور طبعی خواص تک میں بھی سر مو فرق نہیں ہوتا۔ تو ان سارے مظاہر کی توجیہ "از خود حیات" کے نظریہ کے تحت نہیں ہوتی بلکہ ایک خالق و مربی کا وجود لامحالہ تسلیم کرنا پڑتا ہے، جو لاکھوں انواعِ حیات میں سے ہر ایک کو اولین طور پر وجود ہی میں نہیں لاتا بلکہ ہر نوع کو اس کی نوعی خصوصیات کے ساتھ بار بار پیدا کر کے اپنی ربوبیت و خلاقیت کا زبردست مظاہرہ بھی کرتا ہے اور ربوبیت کے اس زبردست مظاہرہ سے پوری دنیائے سائنس حیرت زدہ ہے جو اس فعلِ ربانی کی صحیح حقیقت و کیفیت تک سمجھنے سے قاصر ہے۔ اسی بنا پر قرآن عظیم میں "اعادۂ حیات" اور "اعادۂ انواع" کو قدرتِ خداوندی کا ایک خصوصی فعل قرار دیا گیا ہے، جو دنیائے

سائنس کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے:

أَوَلَمْ يَرَوْا كَيْفَ يُبْدِئُ اللَّهُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ إِنَّ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ۔ (عنکبوت: ۱۹)

کیا انھوں نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ کس طرح تخلیق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر اس فعل کو دہراتا ہے؟ یہ بات اللہ کے لیے بہت ہی آسان ہے۔

أَمَّنْ يَبْدَأُ الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ وَمَنْ يَرْزُقُكُمْ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ أَإِلَٰهٌ مَعَ اللَّهِ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ۔ (نمل: ۶۴)

بھلا وہ کون ہے جو تخلیق کی ابتدا کرتا ہے اور پھر اسے دوبارہ وجود بخشتا ہے؟ اور وہ کون ہے جو زمین و آسمان (کی قوتوں کو یکجا کر کے) تمہیں رزق دیتا ہے؟ تو اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی معبود ہے (جو اس حیرت انگیز طریقے سے اعادۂ خلق کر کے تمہارے لیے رزق رسانی کرتا ہو؟) کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو اپنے دعوے کی دلیل پیش کرو۔

وحدتِ خدائی اور تردیدِ شرک

چنانچہ ایک اور موقع پر اس اصول کی مزید وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ انواعِ حیات کی تخلیق اور بار بار ان کا اعادہ وحدتِ خدائی کی ایک اچھوتی دلیل اور ربوبیت کا ایک ایسا معجزہ ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور اس کائنات میں کوئی دوسری ہستی اس کی شریک نہیں ہے:

قُلْ هَلْ مِنْ شُرَكَائِكُمْ مَنْ يَبْدَأُ الْخَلْقَ

کہہ دو کہ تمہارے شریکوں میں کوئی ایسا

ثُمَّ يُعِيدُهُ ۚ قُلِ اللَّهُ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهُ ۖ فَأَنَّىٰ تُؤْفَكُونَ۔

(یونس: ۳۴)

بھی ہے جو تخلیق کی ابتدا کرکے پھر اس عمل کو دہراتا ہو؟ کہدو کہ (صرف) اللہ ہی ہے جو (کسی بھی) مخلوق کا آغاز کرکے پھر اس کا اعادہ کرتا ہے۔ تو تم کہاں بہکے جارہے ہو؟

یہ بیان جس طرح قدیم مشرکین پر صادق آتا تھا اسی طرح وہ موجودہ سائنس دانوں پر بھی صادق آتا ہے۔ چنانچہ دنیائے سائنس نہ تو کسی پیڑ پودے کو پیدا کرسکتی ہے اور نہ اس عمل کا اعادہ کرسکتی ہے۔ پیدا تو وہ کرے جو انواع حیات کی اندرونی مشنری سے واقف ہو۔ حالانکہ دنیائے سائنس زندگی کی ابجد بھی نہیں جانتی۔ لہذا اس پوری کائنات کا ایک ہی خالق ہے ایک ہی کارساز ہے ا[illegible] رب، گا اور اس کی ربوبیت کے نمونے یہ لاکھوں انواعِ حیات ہیں، جو سائنسی نقطۂ نظر سے پورے عالمِ انسانی کے لیے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتے ہیں۔

غرض دنیائے نباتات میں ربوبیت کے جلوے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں اور لاکھوں قسم کے نباتات میں سے ہر ایک پیڑ ربوبیت کا ایک معجزہ ہے جو اپنے حیرت انگیز اصول وضوابط کی پابندی کرتے ہوئے انسان کو درسِ عبرت دے رہا ہے۔ سائنسی نقطۂ نظر سے کسی بھی درخت کی پتی ایک مکمل کارخانہ ہوتی ہے جس میں مواد نشاستہ یعنی کاربوہائیڈریٹ تیار ہوتا ہے اور جو غذا کا ایک بنیادی جزو ہے۔ مگر جس حیرت انگیز طریقے سے وہ تیار ہوتا ہے، اس کی داستان سرائی کے لیے ایک الگ مضمون کی ضرورت ہے۔ نیز اس کے علاوہ اس سلسلے کے اور بھی بہت سے حقائق باقی ہیں جو پھر کبھی بیان کیے جائیں گے، بہرحال شیخ سعدی نے اپنے ایک

شعر میں نباتاتی زندگی کے اسرار کو اس طرح سمیٹ دیا ہے جو دریا بکوزہ کا مصداق ہے۔ ؎

برگ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

اسلام کا مطالبہ حاصل بحث یہ کہ اس کائنات میں حیرت انگیز افعال والی ایک خلاق ہستی کا وجود پایا جاتا ہے جو بڑے ہی انوکھے طریقے سے مخلوق کی رزق رسانی میں لگی ہوئی ہے، لہذا اسلام کا تقاضا ہے کہ اسی خلاق ہستی کو اپنا معبود و مسجود بنا کر اس سے تعلق استوار کیا جائے اور یہ مطالبہ دقیانوسیت کی نشانی یا دورِ وحشت کی یادگار نہیں بلکہ موجودہ سائنسی دور کی ایک اہم ضرورت ہے اسی لیے ایک موقع پر فرمایا گیا کہ اللہ کا رزق کھا کر اس کی شکر گزاری کرو اس کی ناشکری کرکے اس کی خدائی میں کسی دوسرے کو شریک نہ بناؤ:

وَأَنْزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَأَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔

(بقرہ: ۲۲)

اور اس نے آسمان (کی بلندی) سے پانی برسایا پھر اس سے تمہاری رزق رسانی کے لیے طرح طرح کے پھل اگا دیے۔ تو تم جان بوجھ کر کسی کو شریک نہ بناؤ۔

یہ بیان جس طرح قدیم مشرکین پر صادق آتا تھا جو خدا کی خدائی میں دیگر دیوتاؤں کا بھی حصہ بتاتے تھے بالکل اسی طرح وہ موجودہ منکرین اور مادہ پرستوں پر بھی صادق آتا ہے جو حقائق سے منہ موڑ کر مادیت کی وادیوں میں بھٹک رہے ہیں اور خدا کی صفات کو مادہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے مادہ ہی کو گویا کہ خدا قرار دے رہے ہیں۔ اس اعتبار سے خدائے وحدہ لاشریک کا انکار بھی شرک ہی کی ایک قسم ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کا انکار کرتے ہوئے اس کی ساری صفات کو مادہ کی طرف منسوب کرنا گویا کہ مادہ کو خدا قرار دینا ہے۔ لہذا انسان کو چاہیے کہ وہ حقیقت پسندی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنے اصلی خالق ورازق کو پہچانے اور اس کا شکر گزار بنے۔

مکی مواخات۔ اسلامی معاشرہ کی اولین تنظیم

از
پروفیسر ڈاکٹر محمد یسین مظہر صدیقی ندوی

(۲)

مکی مواخات کی توقیت

اوپر بیان کیا جاچکا ہے کہ مکی دورِ حیات کے بہت سے گوشے کتب سیر و تاریخ میں مستور رہ گئے ہیں اس لیے .... ان کی بنیاد پر مکی مواخات کے وقت کا تعین مشکل ہے۔ ہم نے بعض دوسرے واقعات و تصریحات اور قرائن کی بنیاد پر اسے متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ بعض روایات کے بین السطور یہ صراحت ملتی ہے کہ جب مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کی "معتد بہ" اور خاطر خواہ تعداد ہوگئی تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے درمیان مواخات قائم کی۔ منطقی طور سے بھی یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کہ "معتد بہ" تعداد کے بغیر مواخات اور بھائی چارہ کرانا نہ ممکن تھا اور نہ مناسب اور ضروری۔ اس کی تائید مدنی مواخات کے واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ اول اول جب مہاجرین و انصار کے درمیان مواخات کا رشتہ استوار کیا گیا تو ان کی مجموعی تعداد نوے یا پچاس پچاس کے دو حصوں پر مشتمل ایک سو نفوس قدسیہ تھی۔ مگر یہ واضح رہے کہ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی کل تعداد اتنی ہی نہیں تھی بلکہ اس وقت مدینہ کی آبادی ہزار نفوسِ اسلامیہ سے اوپر تھی۔ اس پر راقم نے اپنے ایک مضمون میں مفصل بحث کی ہے جو تحقیقاتِ اسلامی علی گڑھ میں

۱۹۸۰ء کی جلد ۶ شمارہ ۲ و ۳ میں چھپ چکا ہے۔

مکی مواخات سے متعلق جو تاریخی روایات ملتی ہیں ان کی اندرونی شہادت یہ ثابت کرتی ہے کہ اس کا زمانہ ۶ھ / نبوی یعنی ۱۶-۶۱۵ء کے آس پاس کا ہے کیونکہ اس دور کی مواخات کا پہلا جوڑا حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ پر مشتمل تھا اور موخرالذکر صحابی جلیل نے اسی زمانے میں اسلام قبول کیا تھا۔ ایک اور عظیم شخصیت حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمیؓ کی بھی ان دینی بھائیوں میں بتائی جاتی ہے اور وہ بھی اسی دور میں مشرف بہ اسلام ہوئے تھے، جس کی تفصیل تمام کتب سیر میں موجود ہے ان دونوں کے علاوہ تمام دوسرے جوڑے قدیم یا ابتدائی دور کے مسلم تھے گو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں عام روایات میں ہے کہ وہ چالیس مردوں اور دس عورتوں کے بعد اسلام لائے تھے لیکن دراصل مسلم تعداد غالباً مکہ مکرمہ میں اس سے بھی زیادہ تھی۔ بہرکیف ان روایات سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ مسلم تعداد کے معتد بہ یا خاطر خواہ ہونے کے بعد ہی مکی مسلمانوں میں مواخات کا رشتہ استوار کرایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ بھی بعض دوسرے حالات، اسباب و عوامل اور واقعات بتاتے ہیں کہ مکی مواخات غالباً نبوت کے پانچویں چھٹے سال میں رو بہ عمل لائی گئی تھی۔

ان واقعاتی شواہد میں اہم ترین سبب اور بنیادی عامل خاندانوں سے مسلم افراد و طبقات کا انقطاع اور مکی سوسائٹی میں ان کا معاشرتی مقاطعہ تھا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں جب تک تبلیغ کا کام خفیہ طور پر ہو رہا تھا بہت سے افراد و طبقات کے اسلام کا پتہ نہیں چلتا تھا اور جن کے بارے میں معلوم بھی ہوگیا اس کو ان کی مذہبی ترنگ پر محمول کرکے انگیز کرلیا گیا، لیکن جب علانیہ دعوت شروع ہوئی اور مسلم تعداد ہر خاندان میں بڑھنے لگی تو قریشی اکابر کو تشویش ہوئی کہ ان کا سارا نظام معاشرت جلد درہم برہم ہوجائے گا تو باطل قوتوں کی دینِ حق کی مخالفت میں

شدت پیدا ہوگئی۔ طنز و تعریض، استہزا، و تمسخر اور لعن و طعن سے بڑھ کر جسمانی تعذیب تک معاملہ جا پہونچا اور جب اذیت و تکلیف کے طوفان کے سامنے اہل اسلام ثابت قدم اور چٹان کی طرح مستحکم نظر آئے تو ان کا سماجی مقاطعہ یوں کیا گیا کہ ان کو ان کے خاندانوں نے نہ صرف تعذیب و تکلیف کا نشانہ بنایا بلکہ ان سے قرابت و رشتہ داری کے تعلقات منقطع کر لیے[۱]۔ اسی سبب سے قرآن مجید میں صلہ رحمی کرنے کے احکام دیے گئے اور قطع رحم کی ممانعت کی گئی ہے جس کی تفصیل سورۂ رعد، نحل، اسرا، روم، فاطر اور شوریٰ وغیرہ مختلف مکی سورتوں میں موجود ہے۔

حضرت عمر اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما کے قبول اسلام کے واقعات اور ان کے پس منظر سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اسوقت تک نہ صرف مسلم افراد و طبقات کی تعذیب و تکلیف شروع ہو چکی تھی بلکہ سماجی مقاطعہ اور معاشرتی قطع تعلق اور خاندانی ترک روابط کا سلسلہ بھی قائم ہو چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اعلان اسلام کے بعد جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسی نڈر اور بارعب شخصیت پر ظلم و ستم کی یورش عین صحن مسجد حرام میں ہوئی تو ان کے خاندان کے کسی فرد نے نہیں بلکہ بنو سہم کے سردار عاص بن وائل سہمی نے ان کو بچایا اور "پناہ" میں لیا تھا[۲]۔ یہ خاندانی حمیت و حمایت کے انقطاع کا زمانہ تھا کہ عرب جاہلی خاندانی روایات کے خلاف قریشی خاندانوں اور مکی خانوادوں نے اپنے ہی افراد و ارکان کو برادری باہر کر دیا تھا۔ حبشہ کی ہجرت اسلامی کا بھی ایک سبب یہی تھا کہ مکی خاندانوں کے اشراف بھی قرابت کی حمایت سے محروم ہو چکے تھے۔ بنو امیہ کے خاندان سعیدی کے جلیل القدر مسلمانوں کا بھی اخراج ہو چکا تھا ایک اہم شہادت یہ ہے کہ جب حبشہ کے مہاجرین کرام مکہ والوں کے قبول اسلام کی افواہ سن کر وطن پلٹے تو ان کو ان کے خاندان نے قبول نہیں کیا اور ان کو دوسرے قریشی خاندانوں اور ان کے اکابر کی حمایت و جوار حاصل کرنی پڑی۔ ایسی صورت حال میں مکی مسلمانوں کی مواخات

اور ان کی سماجی شیرازہ بندی ناگزیر بن گئی تھی۔ بعد میں خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بنو ہاشم نے عاق کر دیا تھا اور ان کو بنو نوفل کی پناہ لینی پڑی تھی۔ ان واقعات کی تفصیل سیر و تاریخ کے علاوہ کتب حدیث میں بھی موجود ہے۔

مکی مواخات سے وابستہ مسلمانوں کی تعداد

مکی و مدنی مواخات کے ضمن میں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کتنے مسلمانوں میں بھائی چارہ استوار کرایا تھا؟ اول الذکر کے متعلق صرف آٹھ جوڑوں یا سولہ صحابہ کرام کا نام ملتا ہے اور موخر الذکر میں نوے یا سو صحابہ کا۔ ظاہر ہے یہ کل تعداد نہ تھی۔ مکی مواخات کا زمانہ اگر نبوت کے پانچ سال بعد بھی مانا جائے تو اس وقت تک مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ ہو چکی تھی۔ ابن ہشام نے حبشہ کے مہاجرین کی تعداد پہلے پانچ اسلامی برسوں میں ایک سو تین بتائی ہے جس میں زیادہ تر مرد اور کچھ عورتیں شامل ہیں، حالانکہ یہ بھی کامل تعداد نہیں ہے بلکہ راقم کے خیال میں اس وقت مسلمانوں کی تعداد کئی سو افراد پر مشتمل تھی۔ لہذا ان سب کے درمیان لازماً مواخات کی استواری بھی ہوئی ہوگی، جیسا کہ مدنی مواخات میں ہوا تھا[۳]۔

مواخات کی اس تعداد کو تحدید پر محمول کرنا درست نہیں ہے، دراصل مکی مواخات میں صرف سولہ صحابہ کرام کا شامل ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ مکی بھائی چارے میں یہ پہلی یا سب سے اہم جماعت تھی۔ اس کے علاوہ متعدد بہت سے حضرات تھے جن کو مواخات کے ذریعہ ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ کیا گیا تھا تاکہ اسلامی معاشرہ میں یگانگت و یکجہتی پیدا ہو اور مکی مسلمانوں میں ایک امت اسلامی سے وابستگی و تعلق کا احساس و شعور ہو جو مکی معاشرہ اور قریشی سماج سے ہر لحاظ سے منفرد و ممتاز تھا، جس کی اہم ترین خصوصیت یہ تھی کہ دین اسلام کو بطور ایک معاشرتی اکائی اور سماجی بنیاد کے تسلیم کیا گیا تھا اور جس میں علاقائی

طبقاتی، لسانی، قبائلی، تہذیبی حتیٰ کہ خون کے رشتے بھی ثانوی درجہ رکھتے تھے، اسلامی
سماجی نظام کی اس مثال سے تمام مکہ، اشراف قریش اور کل عرب کے علاوہ عالم کو
یہ پیغام دیا گیا تھا کہ اس میں سب سے زیادہ اہمیت دین کے رشتہ و تعلق کو حاصل ہے
اور افضلیت و اشرفیت کی بنیاد دینی مرتبہ و مقام ہے جس کو اسلامی اصطلاح میں "تقویٰ"
کہا جاتا ہے[۵۴]۔

مواخات کا تسلسل و استقلال بیشتر جدید مورخین و سیرت نگاروں نے مدنی مواخات کی
ایک مثال کی وجہ سے یہ تاثر ظاہر کیا ہے کہ مواخات ایک عارضی انتظام تھا[۵۵]۔ لیکن بعض نے
اصل حقیقت کا ادراک کر لیا ہے اس لیے ان کے نزدیک مواخات ایک مستقل نظام تھا[۵۶]۔
اور یہی بات اسلامی تعلیمات اور قرآنی ارشادات کے مطابق ہے کہ تمام مسلموں کو اور مومنوں
کو جو بھائی قرار دیا گیا ہے وہ مستقل، ابدی اور آفاقی ہے۔ اسی طرح امت اسلامی بھی آفاقی،
عالمی اور مستقل ثابت ہوتی ہے۔ منطقی طور سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اخوت و محبت، یگانگت
و الفت اور یک جہتی و اتحاد جیسی اقدار عالیہ مطلقہ مستقل وجود رکھتی ہیں اور ان کی بنیاد پر
استوار معاشرہ بھی استقلال کے عنصر سے لازمی طور سے وابستہ ہوتا ہے۔

مکی معاشرہ ہو یا مدنی دونوں اسلامی تھے اور اسلامی اور دینی اخوت پر مبنی۔ لہذا
وہ بھی مستقل اور لازمی طور سے وجود میں آنے کے بعد پائیدار انتظامات بن گئے تھے۔ سنہ ۶۱۵-۱۶ء
میں جب مکی مواخات روبہ عمل لائی گئی تو وہ مستقل اور مسلسل بنیاد یگانگت بن گئی۔ اس کا واضح
مطلب ہوا کہ جس وقت مکی مواخات کا آغاز ہوا اس وقت تمام صحابۂ کرام کو اس رشتہ کے
ذریعہ ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا گیا۔ پھر بعد میں جوں جوں اور جب جب لوگ مسلمان ہوتے
گئے ان کو ایک دوسرے کے ساتھ اسی دینی رشتہ میں منسلک کر دیا گیا۔ تاریخی طور سے یہ

مواخات اسلامی کا سلسلہ اپنے آغاز سے ہجرت مدینہ تک برابر جاری رہا تاکہ مسلمانان مکہ میں
اخوت و یگانگت و یک جہتی پیدا ہوتی رہے۔ مگر بعد میں مکہ میں مسلمانوں کی مواخات اور بھائی
چارے کا کوئی ذکر نہیں ملتا۔ تاہم مدنی مواخات کے سلسلہ کی بعض روایات یہ بتاتی ہیں
کہ متاخر مسلمانوں یا مدینہ منورہ میں بعد میں سکونت پذیر ہونے والے کے درمیان بھی
مواخات استوار کرنے کا سلسلہ جاری رہا لیکن عموماً ان روایات اور ان سے ثابت
مسلمانوں کی مواخات کی مثالوں پر تنقید کر کے ان کو غیر صحیح ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ حالانکہ دقت نظر
سے جائزہ لینے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ واقعی بعد کی مواخات کی مثال ہے۔ ایک روایت
ملاحظہ ہو۔ حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمی کی مواخات حضرت معاذ بن جبل خزرجی سے
کرائی گئی تھی، جبکہ وہ غزوۂ خیبر کے بعد مدینہ میں سکونت پذیر ہوئے تھے[۵۷]۔ لیکن اس روایت
کا انکار محض اس لیے کر دیا گیا کہ مواخات کے بارے میں یہ غلط خیال قائم ہو گیا ہے کہ
بدر کے بعد وہ باقی نہیں رہی تھی، حالانکہ غزوۂ بدر کے بعد دراصل دینی رشتہ داروں کی
وراثت کا حکم باقی نہیں رہا تھا۔ باقی مواخات اپنی جگہ قائم رہی جیسا کہ روایات سے ثابت
ہوتا ہے اور بیشتر سیرت نگاروں اور مورخوں نے اسے تسلیم بھی کیا ہے[۵۸]۔

محمد بن حبیب بغدادی کے مطابق رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی مسلمانوں میں جب
مواخات قائم کی تھی تو حضرت طلحہ بن عبید اللہ تیمی کی مواخات حضرت سعید بن زید تیمی کے
درمیان استوار کی تھی۔ یہی حافظ عبد البر نے بھی بیان کیا ہے اور بعض دوسری روایات میں
بھی اس کا حوالہ صراحتاً یا اشارتاً ملتا ہے[۵۹]۔ مگر حافظ ابن حجر عسقلانی نے مواخات اولیٰ کا
جو واقعہ امام حاکم سے نقل کیا ہے اس میں حضرت جمیع بن عمیرؓ نے حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے
یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ کے درمیان مواخات استوار کی گئی تھی جب کہ

بغدادی اور ابن عبد البر قرطبی کے مطابق حضرت زبیرؓ بن عوام اسدی کے دینی برادر حضرت عبد اللہ بن مسعود ہذلی بنائے گئے تھے۔ افسوس کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام حاکم کی روایت کے صرف حضرات شیخین اور حضرات عثمانؓ وعبد الرحمنؓ بن عوف نیز حضرات طلحہؓ و زبیرؓ کے اسمائے گرامی نقل کیے ہیں اور باقی کا نام لیے بغیر صرف یہ کہہ کر گزر گئے کہ امام حاکم نے ایک جماعت کا ذکر کیا ہے [۵۵]

جیسا کہ بتایا گیا مستدرک حاکم کی محولہ بالا روایت میں صرف حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ طلحہؓ و زبیرؓ اور عثمانؓ و عبد الرحمنؓ کے ناموں کی صراحت ہے باقی روایت کا تعلق حضرت علیؓ کی مواخات نبوی سے ہے۔ حافظ ذہبی کی تلخیص مستدرک میں مواخات سے متعلق مذکورہ بالا روایت بھی موجود ہے اور اس سے قبل جمیع بن عمیر تیمی کی ایک اور روایت بھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ کی رسول اللہؐ سے مواخات مدینہ میں ہوئی تھی۔

علامہ زرقانی نے بھی حافظ ابن عبد البر کا یہ بیان کہ مواخات دوبار ہوئی تھی ذکر کرکے حق و مواسات کی بنیاد پر امام حاکم سے یہی نقل کیا ہے کہ حضرت طلحہؓ کی مواخات حضرت زبیرؓ سے کی گئی تھی بلکہ امام حاکم ہی نے ایک دوسری روایت کے بارے میں لکھا ہے کہ حضرت زبیرؓ کی مواخات حضرت ابن مسعودؓ سے اور حضرت حمزہؓ کی زیدؓ بن حارثہ سے قائم کی گئی تھی۔ جب کہ اولین مذکورہ روایت میں حضرات حمزہؓ اور زیدؓ بن حارثہ کے درمیان مواخات کا ذکر نہیں ہے [۵۶]

مواخات علیؓ کا مسئلہ

بقول زرقانی حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت علیؓ کی مواخات کے باب میں "احادیث کثیرہ" وارد ہیں۔ امام ترمذی نے بھی ایک حدیث نقل کرکے اسے "حسن" قرار دیا ہے۔ اسی کو امام حاکم نے بھی نقل کیا ہے، صحیح بتایا ہے۔ یہ حدیث حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا: "کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ میں

تمہارا بھائی ہوں؟ عرض کیا: کیوں نہیں؟ فرمایا: تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو"

حافظ ابن عبد البر نے مواخات حضرت علیؓ سے متعلق کئی احادیث نقل کی ہیں: ایک تو وہی ہے جو اوپر امام ترمذی و امام حاکم کے حوالے سے نقل ہو چکی جس کا سیاق حافظ ابن عبد البر نے اس طرح پیش کیا ہے کہ دنیا و آخرت میں بھائی ہونے کا فرمان ذات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کے مابین مواخات کے استوار ہونے کے بعد وقوع پذیر ہوا تھا۔ دوسری روایت حضرت ابن عباسؓ کی سند سے مروی ہے، جس میں ارشاد نبوی ہے کہ تم میرے بھائی اور صاحب ہو (انت اخی و صاحبی)۔ تیسری روایت بھی حضرت ابن عباسؓ کی ہے کہ حضرت علیؓ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کی قسم! میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھائی اور ولی ہوں (واللہ انی لاخو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و ولیہ)۔ چوتھا عباد بن عبد اللہ کا قول ہے کہ انہوں نے حضرت علیؓ کو فرماتے ہوئے سنا: "میں اللہ کا بندہ اور اس کے رسول کا بھائی ہوں اور میرے بعد جو بھی ایسا کہے گا وہ کذاب و بہتان تراش ہوگا" (انا عبد اللہ واخو رسولہ ولا یقولہا بعدی الا کذاب مفتر)۔ یہی روایت تھوڑے سے فرق کے ساتھ ابو سلیمان جہنی یعنی حضرت زید بن وہب سے مروی ہے (انا عبد اللہ واخو رسولہ لم یقلہا احد قبلی، ولا یقولہا احد بعدی الا کذاب مفتر)"

حافظ ابن سید الناس نے اپنی سند پر امام حاکم کی جمیع بن عمیر کی وہ روایت بیان کی ہے جو مواخات کے بارے میں حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کے درمیان مواخات قائم کی تو ابوبکرؓ و عمرؓ کو بھائی بنایا اور فلاں اور فلاں کو بنایا تاآنکہ صرف حضرت علیؓ باقی رہ گئے۔ وہ بہادر اور اپنے فیصلہ کو نافذ کرنے والے مرد میدان تھے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو دنیا و آخرت میں اپنا بھائی قرار دیا۔ حافظ موصوف

کے ہاں متن کے اضافہ کے علاوہ سند میں مزید یہ صراحت ملتی ہے کہ ایک راوی کثیر النواء نے جمیع بن عمیر سے حلف و شہادت طلب کی تھی کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے واقعتاً یہ روایت نقل کی تھی۔ اگر تلاش و تفحص سے کام لیا جائے تو زرقانی کا یہ تبصرہ قریب قریب صحیح ثابت ہوتا ہے کہ اس باب میں بہت سی حدیثیں ملتی ہیں۔ اسی بنا پر مواخاتِ علیؑ کی روایات کو ایک واقعہ سمجھا اور مانا جاتا ہے۔

لیکن امام ابن تیمیہ جیسی عظیم شخصیت نے مواخات علیؓ سے متعلق تمام روایات کو "اکاذیب" جھوٹ کا پلندہ قرار دیا ہے۔ بالخصوص اس روایت کو جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وارث، ولی، وصی وغیرہ قرار دیا گیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار و مہاجرین کے درمیان مواخات استوار کی تھی اور ایک مہاجر کا دوسرے مہاجر سے بھائی چارہ نہیں کرایا تھا، اس لیے یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ ایک اور دلیل یہ دی گئی ہے کہ اگر اس مواخات کو مکی دور کا واقعہ تسلیم کیا جائے تو وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زیرِ کفالت تھے لہذا ان کو دینی بھائی قرار دیے جانے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ مواخات تو صرف اس لیے استوار کی گئی تھی کہ صحابۂ کرام میں سماجی و معاشرتی تعلقات پیدا کیے جائیں جو بے وطنی، "غربت"، خاندان سے قطع تعلقی اور وحشت و بے سروسامانی کی وجہ سے منقطع ہو گئے تھے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ امام ابن تیمیہ نے اس باب میں قیاس کی بنا پر جو روایات و اخبار اور احادیث کا انکار کر دیا ہے وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت زبیرؓ ہی کے درمیان نہیں بلکہ بعض دوسرے مہاجرین کے درمیان بھی مواخات استوار کی تھی، لہذا یہ صحیح حدیث اور معتبر روایت سے بھی

ثابت ہوتا ہے۔ دوسرے دو مہاجر بھائیوں کی ایک دوسرے سے مواخات دینی کے ذریعہ وابستگی میں ایک حکمت و مصلحت یہ پوشیدہ تھی کہ ادنیٰ کو اعلیٰ سے وابستہ کر دیا جائے تاکہ کمزور و فروتر کو اعلیٰ و طاقتور سے تقویت حاصل ہو۔ حافظ ابن حجر عسقلانی کی بحث میں بعض اور نکات بھی ہیں۔ ان کا مقصود صرف یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت علیؑ کی مواخات کو ایک صحیح تاریخی واقعہ سمجھا جائے[۱۲]۔

روایات و احادیث کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت علیؓ کی مواخات کے بارے میں جو روایت وارد ہیں وہ دو طرح کی ہیں: اول میں صحابہ کرام کے درمیان مواخات قائم کرنے کا واقعہ بطور پس منظر آیا ہے۔ خواہ وہ مکہ معظمہ میں مہاجرین کے درمیان استوار کی گئی ہو یا مدینہ منورہ میں انصار و مہاجرین کے درمیان استوار کی گئی ہو یا صرف یہ تصریح کی گئی ہو کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب کرام کے درمیان مواخات قائم کی اور اس میں کسی مکان و موقع اور زمانہ یا دینی بھائیوں کے انصار و مہاجرین ہونے کا ذکر نہ ہو۔ دوسری قسم کی وہ روایات ہیں جن میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھائی قرار دیا ہے مگر اس میں اسلامی مواخات کا حوالہ نہیں ہے، صرف بھائی بنانے یا ہونے کا حوالہ ہے۔

دوسری حقیقت یہ روشن ہوتی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے تمام اقوال و آثار اور دوسری روایات و احادیث مواخات مکی یا مواخات مدنی کی صراحت نہیں کرتیں، صرف دینی مواخات یا بھائی ہونے کا ذکر کرتی ہیں۔ ان کی بنا پر مکی یا مدنی مواخات کے دوران حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نبوی بھائی قرار دیے جانے کی بات ثابت نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ ان سے حضرت موصوف کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا بھائی "انما المومنون اخوۃ" ــ قرآنی ارشاد کے

مطابق قرار دیا جاسکتا ہے جیسے کہ دوسرے صحابۂ کرام یا جملہ مومنین ہیں۔ وہ احادیثِ دینی اخوت کے علاوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت علیؓ کی خون کی قرابت اور اخوت کو بھی ثابت کرتی ہیں اور یہ واقعہ ہے کہ وہ آپؐ کے ابن عم ہونے کے سبب بھائی بھی تھے۔ امام ترمذی، امام حاکم، حافظ ابن عبدالبر وغیرہ کی بیشتر روایات اسی اسلامی اخوت کا ذکر کرتی ہیں۔

البتہ امام ابن عبدالبر، امام حاکم اور حافظ ابن سید الناس کی دوسری روایات میں مکی / مدنی مواخات کا ذکر موجود ہے۔ اس کا ایک مفہوم تو وہی ہے جو ان امامانِ حدیث اور دوسرے سیرت نگاروں نے نکالا ہے کہ مواخات قائم کرتے وقت آپؐ نے حضرت علی کو بھائی قرار دیا تھا لیکن یہ محض استنباط ہے۔ الفاظِ حدیث اور فرمانِ نبوی کے متن سے جو مفہوم ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے استفسار پر آپؐ نے فرمایا تھا کہ تم میرے دنیا و آخرت کے بھائی ہو۔ اس سے مراد وہ اصطلاحی معنی کی مواخات نہیں ہے بلکہ صرف دینی اخوت و تعلق خاطر مراد ہے۔ کیونکہ اس میں دنیا و آخرت یا دونوں جہانوں کی "اخوت" کا حوالہ ہے، جس کا رشتہ مکی مواخات سے نہیں جوڑا جاسکتا۔ بغدادی، عسقلانی، قرطبی، ابن سید الناس وغیرہ تمام سیرت نگاروں اور روایت نویسوں نے اس کا جو تعلق مکی مواخات سے جوڑ دیا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ اسی بنا پر امام ابن تیمیہ نے اس نوع کی تمام روایات سے انکار کیا ہے[۳۱]

حافظ ابن حجر عسقلانی نے امام ابن تیمیہ پر جو یہ تنقید کی ہے کہ انہوں نے روایات واخبار کا محض قیاس کی بنا پر انکار کر دیا ہے اس کے متعلق یہ صراحت کرنے کی ضرورت اہل علم کے سامنے نہیں رہتی کہ درایت کی بنیاد پر حدیث و روایت کا درجۂ ثقاہت متعین کیا جاتا ہے۔ امام ابن تیمیہ نے ان کو جن بنیادوں پر "اکاذیب" قرار دیا ہے ان کا تعلق قیاس سے نہیں درایت سے ہے۔ پھر یہ طرفہ ستم ہے کہ حافظ ابن حجر نے امام موصوف پر قیاس سے کام لینے کا

جو حکم لگایا ہے اس سے وہ خود بھی بری نہیں ہیں کیونکہ مکی مواخات کی حکمت و مصلحت بیان کرتے ہوئے وہ بھی محض قیاس سے کام لیتے ہیں کہ مکی برادروں کے دو جوڑوں میں افراد و شخصیات کا انتخاب کرتے ہوئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ملحوظ رکھا تھا کہ ایک کمزور و فروتر (الادنی بالاعلی ——) کا ایک برتر و طاقتور سے مواخات کا رشتہ قائم کیا جائے تاکہ ادنی کو اعلی سے طاقت ملے۔ حافظ موصوف نے اس کے بعد بعض ادنی و اعلی افراد کے جوڑوں کا تذکرہ کیا ہے اور اس کے ذریعہ اپنے قیاس کی تائید بھی فراہم کی ہے۔

مگر مجموعی تجربے اور گہرے مطالعہ سے نہ حافظ ابن حجر عسقلانی کا قیاس صحیح معلوم ہوتا ہے اور نہ ان کا اسلامی جوڑوں کے مواخاتی رابطہ کا اندازہ۔ بعض دینی برادروں کے جوڑوں کے بارے میں تو ان کا قیاس صحیح معلوم بھی ہو سکتا ہے جیسے حضرت حمزہ اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کے بارے میں —— یعنی ان دینی برادروں کے بارے میں جن کا انہوں نے انتخاب کر کے تذکرہ کیا ہے۔ مگر انہوں نے بعض ہم پلہ دینی برادروں کے بارمیان وجہ رابطہ اور بنیاد اخوت کا تذکرہ نہیں کیا۔ مثلاً حضرات ابوبکرؓ و عمرؓ ہم پلہ و ہم رتبہ بزرگ تھے کہ ان میں سے کوئی فروتر و برتر یا ادنی و اعلی نہ تھا۔ یہی صورتِ حال حضرات طلحہؓ و زبیرؓ، عثمانؓ و عبدالرحمنؓ، مصعبؓ بن عمیر و سعدؓ بن ابی وقاص وغیرہ کے درمیان نظر آتی ہے۔ سماجی، اقتصادی اور تہذیبی غرضکہ ہر سطح پر ان دونوں بھائیوں کے درمیان یگانگت و ہمسری نظر آتی ہے اور ایسا ہی معاملہ دوسرے دینی بھائیوں کا تھا۔ مکہ مکرمہ کی مواخات میں بھی اور مدنی مواخات میں بھی۔ موخرالذکر واقعہ کے حوالے سے دینی برادروں کے انتخاب و وابستگی کی بنیاد اور وجہ کچھ اور نظر آتی ہے، روایات میں اور قیاس و تجربہ کے لحاظ سے بھی۔

باہمی مواخات میں انتخاب و وابستگی کی بنیاد علامہ شبلی نعمانی (۱۲۷۴-۱۳۳۲ھ / ۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) نے بھی مواخات کے

رشتہ میں پروئے جانے والے اسلامی بھائیوں کی باہمی وابستگی کے بارے میں قیاس عمدہ تجزیہ کیا ہے: "شرفِ صحبت کی برکت سے مہاجرین میں ان قابلیتوں کا ایک گروہ تیار ہوچکا تھا اور ان میں یہ وصف پیدا ہوچکا تھا کہ ان کی درسگاہِ تربیت سے اور ارباب استعداد بھی تربیت پاکر نکلیں۔ اس بنا پر جن لوگوں میں رشتۂ اخوت قائم کیا گیا ان میں اس بات کا لحاظ رکھا گیا کہ استاد اور شاگرد میں وہ اتحادِ مذاق موجود ہو جو تربیت پذیری کے لیے ضرور ہے۔ تفحص اور استقصاء سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص جس کا بھائی بنایا گیا، دونوں میں یہ اتحادِ مذاق ملحوظ رکھا گیا ..." علامہ شبلی نعمانی نے اس لحاظ کو "شانِ نبوت کی خصوصیات میں سے" قرار دیا ہے اور پھر حضرات سعیدؓ بن زید وابیؓ بن کعب ابو حذیفہؓ اموی وعبادؓ بن بشر اوسی ابو عبیدہؓ وسعدؓ بن معاذ اور بعض دوسرے دینی برادروں کے اتحادِ مذاق اور "وحدت" کو ثابت کیا ہے۔[۱۱]

عام سیرت نگاروں نے جو روایت پسندی اور اخبار پرستی کے لیے مشہور ہیں اس اہم مسئلہ پر کلام نہیں کیا ہے۔ علامہ شبلی نے بھی مدنی مواخات کے حوالہ سے مواخات کے باہمی رشتہ کی بنیاد کا ذکر کیا ہے۔ اتحادِ مذاق اور وحدتِ خیال کا لحاظ مکی مواخات کے ضمن میں کسی حد تک صحیح ہوسکتا ہے مگر اصل بنیاد وابستگی اور واقعی نہادِ ارتباط یہ معلوم ہوتی ہے کہ دونوں بھائیوں کے سماجی، معاشرتی، اقتصادی اور تہذیبی توافق اور ہمسری و ہم آہنگی کا لحاظ رکھا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات شیخین۔ ابوبکرؓ و عمرؓ کے درمیان مواخات قائم کی گئی کہ وہ دونوں قریش کے نسبتاً دو کم اہم خاندان۔ بنو تیم اور بنو عدی۔ کے افراد ہونے کے باوجود مکی اشرافیہ کے عہدے دار اور منصب دار رہے تھے۔ دونوں جاہلی اور اسلامی ادوار میں سرداران قریش و سرداران اسلام تھے۔ دونوں متمول و خوش حال تاجر تھے۔ دونوں

صاحب اثرات سماجی سربراہ تھے، دونوں صاحبان سیادت وجلادت تھے۔ غرضکہ دونوں ہر طرح ہم آہنگ اور ہم رتبہ تھے۔ حضرات عثمانؓ و عبدالرحمنؓ میں قومی سیادت، قریشی وجاہت، اقتصادی مساوات اور سماجی و معاشرتی وحدت پائی جاتی تھی۔ یہی حالت وصورت حضرات طلحہؓ و زبیرؓ میں پائی جاتی ہے کہ دونوں نوجوان خوش حال تاجر، ہم عمر اور ہم مذاق تھے۔ دوسرے مکی مواخاتی بھائیوں کے درمیان بھی معاشرتی ہم پلہ ہونے کا لحاظ نظر آتا ہے اور یہی اصل وجہ وابستگی معلوم ہوتی ہے۔ یہ اصل اسلامی کفائت (کفو) ہونے کا تصور ہے تاکہ معاشرت میں آسانی ہو۔

مکی مواخات میں خاندانی عنصر معروف ومشہور سیرت نگار ابن اسحاق جو ابھی تک کی معلومات کے مطابق اولین وعظیم ترین مولف سیرت سمجھے جاتے ہیں۔ مکہ مکرمہ کے ابتدائی برسوں میں مسلمانوں کا تجزیہ ان کے خاندانوں اور قبیلوں کے لحاظ سے کرتے ہیں اور ہر خاندان کے مرد وزن کا نام بیان کرتے ہیں۔ مولانا مودودی نے ابتدائی مسلمانوں کی اسی فہرست کی بنیاد پر پہلے تین سال کے مسلمانوں کی ایک زیادہ بڑی فہرست مرتب کی ہے وہ بھی مکمل نہیں ہے۔[۱۲] بہرحال اس سے قریش اور مکہ مکرمہ کے مسلمانوں کے خاندانوں اور ان کے ایک سے زیادہ افراد جن میں مرد وزن دونوں شامل تھے موجود ہونے کا علم ہوتا ہے۔ مثلاً بنو ہاشم میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی کم ازکم چار بناتِ مطہرات کے علاوہ حضرات جعفرؓ و علیؓ فرزندانِ ابی طالب، انکے چچا حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب، ان کی دو پھوپھیاں صفیہؓ اور اروی دختران عبدالمطلب وغیرہ زمانۂ مواخات مکی کے مسلم تھے۔ بنو مطلب / بنو عبد مناف میں حضرت عبیدہؓ بن حارث اور ان کے کم ازکم دو بھائی مسلمان ہوگئے تھے۔ بنو امیہ / بنو عبد مناف میں سے حضرات عثمانؓ بن عفان خالدؓ بن سعید بن العاص اور ان کے برادر عمروؓ اور ان کی بیویاں حضرت ام حبیبہؓ بنت ابی سفیان اموی جو زوجۂ عبیداللہ بن جحش اسدی خزیمی تھیں۔ جبکہ اسی خاندان کے عظیم تر

حصہ بنو عبدشمس کے حضرت ابو حذیفہؓ بن عتبہ بن ربیعہ ان کی اہلیہ اور ان کے مولیٰ حضرت سالمؓ مسلمان تھے۔ بنو اسد اخزیمہ کے تقریباً بیس۲۰ مرد و زن مسلم تھے جو بنو امیہ کے خلفاء بھی تھے اور بنو ہاشم کے ازدواجی رشتہ دار بھی، حضرت ابوبکرؓ بنو تیم سے تھے اور ان کے خاندان میں ان کی والدہ ام الخیر، ان کے فرزند عبداللہؓ، ہوا ور پوتے اور غلام حضرت عامرؓ بن ابی فہیرہ کے علاوہ ان کی کم از کم دو بیٹیاں حضرت اسماءؓ اور حضرت عائشہؓ اور ان کی والدہ حضرت ام رومانؓ مسلم تھیں۔ بنو تیم کے دوسرے مسلم تھے: حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ اور حضرات حارثؓ بن خالد وغیرہ۔ بنو زہرہ کے مسلمان مرد تھے: حضرات عبدالرحمنؓ بن عوف، سعدؓ بن ابی وقاص، ان کے دو۲ بھائی عمیرؓ اور عامر، ان کے عم زاد مطلبؓ بن ازہر اور طلیبؓ بن ازہر اور عبداللہؓ بن شہاب۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسی طرح حضرت عمرؓ کے خاندان بنو عدی کے لگ بھگ آٹھ دس مرد، بنو عبدالدار، بنو جمح، بنو سہم، بنو مخزوم، بنو فہر، بنو عامر بن لوی، بنو عبد قصی اور دوسرے خاندانوں کے افراد اور ان کے خلفاء وموالی ایک سے زیادہ مسلم تھے۔[11] مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خاندان کے دو۲ افراد کے درمیان مواخات نہیں استوار کی، حالانکہ خاندانی عنصر کا لحاظ کیا جاتا تو خون کا رشتہ بھی مواخات کو مزید پشتہ لگا دیتا۔

مگر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خاندانی یگانگت یا قبائلی رشتہ داری کا لحاظ مواخات کے انعقاد و تشکیل کے سلسلہ میں نہیں کیا۔ ایک خاندان کے متعدد افراد اور خون کے قریب ترین رشتہ داروں کی مسلم معاشرہ میں موجودگی کے باوجود آپؐ نے دو مختلف خاندانوں کے افراد کے درمیان مواخات قائم کرائی معلوم دینی برادروں کے خاندانی اور مواخاتی قرابت دو جہت کا تجزیہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ بنو تیم کے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی مواخات بنو عدی حضرت عمرؓ بن خطاب سے کی گئی۔ حضرت عثمانؓ بن عفان اموی تھے تو ان کے دینی برادر حضرت

عبدالرحمنؓ بن عوف زہری، حضرت زبیرؓ بن عوام اسدی تھے تو ان کے اسلامی برادر حضرت طلحہؓ بن عبیداللہ تیمی۔ حضرت عبیدہؓ بن حارث کا تعلق بنو مطلب سے تھا تو حضرت بلالؓ بن رباح تیمی تھے اور رشتہ ولاء کے لحاظ سے حضرت ابوبکر صدیقؓ تیمی کے مولیٰ ہونے کے ناطے تیمی۔ حضرت مصعبؓ بن عمیر بنو عبدالدار کے ایک فرد تھے اور ان کے برادر اسلامی حضرت سعدؓ بن ابی وقاص زہری تھے۔ حضرت ابو عبیدہؓ بن جراح بنو فہر بن مالک کے رکن تھے تو ان کے برادر سالمؓ عبد شمسی مولیٰ تھے کہ حضرت ابو حذیفہؓ عبد شمسی کے مولیٰ تھے۔ بقیہ دوسرے اسلامی برادروں کا بھی یہی حال تھا کہ وہ دو مختلف خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے حتی کہ روایات کا اختلاف بھی ان میں سے دو برادروں کو ایک خاندان کا فرد نہیں ثابت کرتا۔[12] سوائے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی مواخات نبوی کے اور اس روایت کو نہ تسلیم کرنے کا ایک مزید قرینہ یہ بھی ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مواخات میں خاندانی لحاظ اور قبائلی قرابت کو نظر انداز کرنے کے خاص مصالح، دوررس نتائج اور گہرے اسباب تھے۔ سب سے اہم بات اس نظریہ کو روبعمل لانا تھا کہ اسلامی معاشرہ خون کے رشتہ یا خاندانی بنیادوں یا قبائلی قرابتوں پر استوار نہیں ہوتا بلکہ مواخات کی اصل بنیاد دینی قرابت اور اسلامی رشتہ داری تھی۔ یعنی خون کے رشتہ اور دوسرے مبانی کی جگہ اسلامی معاشرہ کی تشکیل و تعمیر مذہب و دین کی بنیادوں پر کی گئی تھی۔ اسی لیے پہلے تجربہ ہی میں دو مختلف خاندانوں کے دو۲ افراد کو اسلامی اخوت کی بنیاد پر باہمی رشتہ مودت میں پرو دیا گیا تھا اور اس طرح خاندانی اور قبائلی حدود سے پرے ایک زیادہ آفاقی، زیادہ ہمہ گیر اور وسیع تر بنیادوں پر معاشرہ کی تشکیل کا آغاز کیا گیا تھا کہ آگے چل کر زبان، علاقہ، رنگ، نسل، خاندان، قبیلہ، خون کے رشتہ اور ہر طرح کے انسانی ساختہ اعتبارات کی جڑ کاٹ کر تمام انسانوں کو بالخصوص مسلمانوں کو آدمیت و انسانیت کی سطح پر مذہب و دین کی

الٰہی بنیادوں پر ایک دوسرے کا عزیز و قریب بنایا تھا؛ مکی مواخات عالمی اسلامی برادری کی اولین صورت گری تھی۔

مواخات کے دیرپا اثرات | مکی مواخات کے بجائے مدنی مواخات کے ضمن میں یہ صراحت مسلسل ملتی ہے کہ اس کے مستقل، دیرپا بلکہ تاعمر اثرات باقی رہے۔ دو بھائیوں میں پیدا شدہ رشتۂ الفت اور تعلقِ خاطر ان کی نفسیات کا حصہ بن گیا بلکہ ان کے خون کے شراروں اور ان کی روح کی گہرائیوں میں ایسا جاگزیں ہوگیا کہ وہ یک جان و دو قالب بن گئے۔ وہ موت میں بھی اور بعد الموت بھی ایک دوسرے کے رفیق و شریک رہے۔ مکی مواخات کے حوالہ سے نہ سہی مگر ان کے تعلق سے وابستہ بھائیوں کے تعلقِ خاطر سے اس کی شہادت ضرور فراہم ہوتی ہے۔

حضرات شیخین تاعمر ہمدم و رفیق رہے اور ان میں جیسا اتحاد و اتفاق رہا اور جس طرح وہ دونوں ایک دوسرے کے صدیقِ حمیم رہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ وہ عہد نبوی میں مکی زمانے سے مدنی دور تک اور پھر خلافتِ صدیقی کے دوران یک جان و دو قالب بنے رہے اور صدیق گئے تو فاروق نے ان کی جگہ لی۔ ان دونوں کی ہم آہنگی کے بارے میں اس قدر کہہ دینا کافی ہے کہ وہ شیخین تھے۔ زندگی میں تو ساتھ تھے ہی مگر موت کے بعد بھی ساتھ ہیں۔[18] حضرت زید بن حارثہ کلبی اور حضرت حمزہ بن عبدالمطلب ہاشمی دونوں مکی مواخات کے ذریعہ بھائی بنے تھے۔ اول الذکر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متبنیٰ تھے اور موخر الذکر عم مکرم ہونے کے علاوہ رضاعی بھائی بھی تھے۔ اسی اسلامی مواخات کے مضبوط رشتہ کا اثر تھا کہ بقول ابن سعد حضرت حمزہ نے غزوۂ احد میں جنگ سے قبل حضرت زید بن حارثہ کو اپنا "وصی" مقرر کیا تھا اور ان کو اپنے تمام امور و معاملات کی وصیت کی تھی اور اسی رشتہ کی بنا پر اور غالباً وصیت کے تعلق سے بھی جب عمرۃ القضاء [۷ھ/۶۲۹ء] کے موقع پر حضرت حمزہ کی دختر نیک اختر حضرت امامہ کی پرورش و نگہداشت کا مسئلہ درپیش ہوا تو

حضرت زید نے اپنا دعویٰ پیش کیا تھا اور بقول ابن اثیر اسی مواخات کی بنیاد پر کیا تھا۔[19]

مکی مواخات ہی کے دل نشیں اثرات تھے کہ حضرات عثمان بن عفان اموی اور عبدالرحمن بن عوف زہری تازندگی ایک دوسرے کے رفیق و ہمدم و مونس اور موید رہے۔ ذاتی تعلقات کے علاوہ دونوں میں سیاسی اتفاق و اتحاد بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد خلیفۂ سوم کے انتخاب کا مسئلہ پیدا ہوا تو حضرت عبدالرحمن زہری نے صدقِ دل سے حضرت عثمان کو خلیفہ منتخب کرنے میں بلاریب سب سے زیادہ اہم حصہ لیا تھا۔ وہ حضرت عثمان کی خلافت کے دوران اپنی زندگی بھر ان کے موید و حامی رہے اور حضرت عثمان نے انکو اپنی خلافت کے پہلے سال امیر حج ہی نہیں بنایا بلکہ ہر طرح سے ان کو مقدم رکھا کہ ان دونوں میں اتحاد و اتفاق اور محبت و خلوص تھا۔ ابن سعد کے مطابق حضرت عمر نے اپنی وفات کی صورت میں چھ صحابۂ کرام کو بطور ممکنہ جانشین مقرر کر دیا تھا۔ ان کے خطبۂ شوریٰ کے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کو ایک ہی جان دو قالب سمجھتے تھے؛ ان کے الفاظ یہ ہیں: اور عبدالرحمن بن عوف اور ان کے "نظیر" (مثال) "عثمان بن عفان" ہیں۔ روایاتِ مصدقہ کے برخلاف ابن سعد کی یہ روایت کہ حضرت عبدالرحمن کی مواخات حضرت سعد بن ابی وقاصؓ زہری سے کی گئی تھی محلِ نظر ہے۔ دوسری روایات مذکورہ کے علاوہ ابن اثیر نے ان کی حضرت عثمانؓ سے ہی مواخات کی روایت نقل کی ہے اور مکی اور مدنی مواخات پر اپنی رائے بھی دی ہے۔[20]

حضرات طلحہ و زبیر کے اتحاد و اتفاق اور عمر بھر کی رفاقت کا سلسلہ قبولِ اسلام کے زمانے سے شروع ہوا کیونکہ اول الذکر تیمی تھے اور موخر الذکر اسدی۔ مکہ مکرمہ میں دونوں ساتھ رہے ساتھ ہی مدینہ ہجرت کی۔ ہجرت کے وقت دونوں تجارت کے لیے ساتھ شام گئے، ساتھ واپس آئے۔ راستہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور تحفے پیش کیے۔ خلافتِ راشدہ میں دونوں

ایک دوسرے کے ہمنوا رہے اور حضرت علی سے دونوں نے حضرت عثمان کا قصاص لینے کی شرط پر بیعت کی، دونوں نے ساتھ مکہ کا رخ کیا، وہاں سے بصرہ گئے اور ساتھ ہی جنگ جمل میں شریک ہوئے اور ساتھ ہی شہید ہوئے۔ ابن سعد اور ابن اثیر دونوں نے حضرت زبیر کی مواخات حضرت عبداللہ بن مسعود سے بتائی ہے جو صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ موخر الذکر نے خود حضرت طلحہ کے سوانح میں یہ تسلیم کیا ہے کہ حضرات طلحہ و زبیر کے درمیان مواخات کی گئی تھی۔[۱۲]

اولاً تو دوسرے صحابۂ کرام کے بارے میں معلومات و روایات بالعموم کم ملتی ہیں، دوسرے ان میں بعض دینی بھائی عہد نبوی کے بعد جلد ہی اپنے رب سے جا ملے تھے جیسے حضرات ابو عبیدہ بن جراح اور سالم مولیٰ ابی حذیفہ، حضرات بلال و عبیدہ بن الحارث وغیرہ۔ بلکہ موخر الذکر تو عہد نبوی میں ہی غزوہ بدر میں شہید ہو گئے تھے لیکن اگر تفحص و جستجو سے کام لیا جائے تو ان دینی اور مواخاتِ مکی کے بھائیوں کے باہمی تعلقاتِ خاطر اور یگانگت و محبت کے اور بھی شواہد مل سکتے ہیں مزید برآں مدنی مواخات سے وابستہ ہونے والے بھائیوں کے تعلقات الفت و محبت سے بھی اس امر کی تائید مزید ہوتی ہے۔ مکی مواخات دراصل عالمی اسلامی برادری کی اولین تشکیل تھی جس نے مدینہ منورہ میں ایک قدم مزید بڑھا کر اسلامی معاشرہ کو اور وسعت اور ہمہ گیر جہت عطا کی اور جو بالآخر دوسرے مراحل سے گزر کر عالمی اسلامی سماجی تنظیم میں ڈھل گئی۔

حواشی

۱؎ قریشی / مکی خاندانوں کا اپنے مسلم افراد کے سماجی مقاطعہ کا ثبوت اور عاق کرنے کا واقعہ بہت سے سابقین اولین کے سوانحی خاکوں میں مذکور ہے، مثال کے طور پر حضرت مصعب بن عمیر عبدری کی "دربدری" ملاحظہ ہو کہ ان کی حقیقی ماں نے ان کو نکال باہر کیا تھا۔ حضرت خالد بن سعید اموی کو ان کے والد ابو احیحہ سعید بن العاص اموی نے خاندان سے الگ کر دیا تھا۔ ۲؎ ابن ہشام اول ص ۵۰-۳۴۹ میں "جوار" دینے کا

ذکر صریح نہیں ہے۔ صرف یہ بیان ہے کہ حضرت عمر کو عاص سہمی نے مشرکوں سے بچایا تھا، مگر بخاری میں لفظ "جار" کا ذکر ہے ملاحظہ ہو: بخاری، صحیح، کتاب مبعث النبی صلی اللہ علیہ وسلم، باب اسلام عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ۵/ ۶۱-۶۰، ابن حجر عسقلانی، فتح الباری، جلد ہفتم ص ۱۳۵، باب اسلام عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ۳؎ حافظ ابن حجر عسقلانی نے صراحتاً لکھا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر دو صحابیوں کے درمیان (بین کل اثنین) مواخات قائم کی۔ اس سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام مسلمانان مکہ میں مواخات کی گئی تھی۔ علاوہ ازیں چند افراد میں مواخات کرنا اور باقی میں نہ کرنا بے معنی بات اور مواخات کے اصل مقصد کو ہی فوت کر دیتا ہے۔ لہٰذا روایتاً و درایتاً دونوں لحاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ مکہ و مدینہ میں تمام مسلمانوں میں بھائی چارہ کرایا گیا تھا ۴؎ مثلاً شبلی نعمانی / سید سلیمان ندوی، سیرت النبی اول ص ۲۸۹ کا بیان ہے کہ "مواخات کا رشتہ بظاہر ایک عارضی ضرورت کے لیے قائم کیا گیا کہ بے خانماں مہاجرین کا چند روزہ انتظام ہو جائے لیکن درحقیقت یہ عظیم الشان اغراضِ اسلامی کی تکمیل کا سامان تھا"۔ مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ۱۹۵۶ء، ص ۲۴۹-۲۴۸ نے تو صرف قومی اتحاد و یگانگت کے مترادف اور عارضی قرار دیا ہے۔ اگرچہ وہ مواخات کی متاخر مثالوں کے بھی قائل نظر آتے ہیں ۵؎ ادریس کاندھلوی، سیرۃ المصطفےٰ اول ص ۴۲۱ تمام مصادر میں مواخات کے استقلال کا اعلان ہے، بالخصوص غزوۂ بدر کے بعد آیات مواریث کے نزول کے بعد دینی برادروں کا حق وراثت منسوخ ہونے کے ضمن میں۔ روایات صراحت کے ساتھ بیان کرتی ہیں کہ حق وراثت کی منسوخی کے باوجود بھی مواخات کا رشتہ حق و مواسات، ہمدردی و غمخواری اور محبت و یگانگت کے حق میں باقی رہا تھا۔ ادریس کاندھلوی نے فتح الباری ہفتم ص ۲۱۰ اور زرقانی اول ص ۳۴۳ کا حوالہ اس ضمن میں دیا ہے ۶؎ مثلاً ابن اسحاق / ابن ہشام اول ص ۵۰۵ کی روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرات جعفر بن ابی طالب ہاشمی اور معاذ بن جبل خزرجی کے درمیان مواخات کرائی تھی، مگر ابن سید الناس اول ص ۲۶۴ نے لکھا ہے کہ واقدی نے اس مواخات کا انکار کیا ہے کیونکہ

اس وقت حضرت جعفر حبشہ میں مقیم اور مدینہ منورہ سے غائب تھے۔ اسی طرح واقدی کو حضرت ابوذر غفاری اور منذر بن عمرو انصاری کی مواخات پر بھی اعتراض ہے کیونکہ حضرت ابوذر غفاری مدینہ میں موجود ہی نہ تھے اور اسی بنا پر وہ بدر و احد اور خندق کے غزوات میں شریک نہ ہوئے اور ان کے بعد مدینہ آئے تھے۔ ابن ہشام نے ابن اسحاق کے بیان پر صرف یہ اضافہ کیا ہے کہ حضرت جعفر اس وقت حبشہ میں موجود و مقیم اور مدینہ سے غیر حاضر تھے۔ اس کا ایک مفہوم تو یہ ہو سکتا ہے کہ غیر حاضری اور عدم موجودگی کے باوجود ان کی مواخات کرائی گئی، دوسرا یہ کہ ان کی مواخات بعد میں ہوئی جب وہ مدینہ آئے اور تیسرا یہ کہ ان کا نام حضرت معاذ کے ساتھ منسلک کرنے میں راوی سے غلطی ہوئی ہے اور وہ مواخات مدنی میں شامل نہ تھے لہذا یہ موقف واقدی نے ان دونوں مثالوں میں اختیار کیا ہے۔

واقدی چونکہ بہت زیادہ معتمد و ثقہ نہیں مانے جاتے لہذا صرف انہی کی تنقید ہوتی تو بعض ثقہ اہل علم اسے مردود قرار دے سکتے تھے مگر ان کے ہم نوا بعض مستند و مسلم اماماِن حدیث و سیرت بھی ہیں (ملاحظہ ہو: ابن سعد، چہارم ص۳۵)

متعدد دوسرے صاحبان تذکرہ و سیرت نے حضرت معاذ بن جبل خزرجی سے حضرت جعفر بن ابی طالب ہاشمی کی مواخات کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس کی جگہ حضرت ابن مسعود ہذلی سے کیا ہے، ابن اثیر اسد الغابہ چہارم ص۳۷۶ اول ص۲۸۷-۹، نیز ابن سعد، سوم ص۵۸۸۔ یہ ابن اسحاق کا سہو (وھل) ہے پھر حضرات معاذ و جعفر میں وحدت نہ تھی۔ اول الذکر بدری صحابی، عالم و مفتی اور اسلامی خدمات کے لیے معروف تھے جبکہ حضرت جعفر حبشہ میں تھے ۵ اگرچہ مدنی مواخات اور اس کے ذریعہ وجود میں آنے والے دینی برادریوں پر بحث اس مقالہ کی حدود سے باہر ہے تاہم اس گتھی کی گرہ کھولنے کی خاطر صرف یہ عرض کیا جاتا ہے کہ مدنی مواخات کی اولین جماعت میں جو نام ملتے ہیں وہ اسی وقت کے برادر نہیں تھے۔ بلکہ مختلف اوقات میں بھائی بنائے گئے تھے لیکن راویوں نے ان کو اولین مثال مواخات کے جوڑے بنا دیا۔ حضرت جعفر بن ابی

طالب ہاشمی کی حضرت معاذ بن جبل خزرجی سے مواخات کا معاملہ ہو یا حضرت ابوذر غفاری کی حضرت منذر بن عمرو انصاری سے دونوں بعد کے یا متاخر زمانے کی مواخات کی مثالیں ہیں یا ان میں سے بعض میں تسامح کا عنصر ہے جیسا کہ حضرت جعفر کے معاملہ میں نظر آتا ہے۔

اس کی تائید مزید حضرات سلمان فارسی و ابو الدرداء عویمر بن عامر خزرجی کی مواخات سے ہوتی ہے کہ دونوں اسلامی معاشرہ کی مواخات میں خندق کے بعد شامل کیے گئے تھے حضرت سلمان اپنی غلامی ہونے کے سبب اور حضرت ابو الدرداء اپنی تاخیر اسلام کے سبب۔ خندق کے بعد اول الذکر نے آزادی پائی اور ثانی الذکر نے اسلام کی دولت تو دونوں کو "وحدت و اتحاد مرتبہ" کے سبب بھائی قرار دیا گیا، حوالہ کے لیے ملاحظہ ہو حاشیہ ۱۸ ۹ حافظ ابن سید الناس، اول ص۲۶۴ میں مذکور ہے کہ حضرات زبیر و ابن مسعود اور حضرات سعید بن زید و طلحہ بن عبید اللہ کے درمیان مواخات کرائی تھی ۱۰ مذکورہ بالا اصحاب کے علاوہ حضرات زبیر و طلحہ کی مواخات کی روایت امام حاکم ہی کی سند سے بعض دوسرے ماخذ میں بھی ملتی ہے مثلاً دیار بکری، اول ص۳۹۸ نے بھی اسے نقل کیا ہے ۱۱ زرقانی اول ص۳۴۹-۵۲ ۱۲ مواخاتِ حضرت علی کے ضمن میں زرقانی، ابن عبدالبر، ابن سید الناس اور ابن حجر عسقلانی کے حوالے اوپر آ چکے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض اور کتب سیرت میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے جیسے دیار بکری اول ص۳۹۸ ۱۳ ابن تیمیہ، المنتقی من منہاج السنۃ اردو ترجمہ غلام احمد حریری، احیاء السنۃ گھر جاکھ۔ گوجرانوالہ، پاکستان ص۴۷۰-۸۰ بالخصوص ص۴۷۶ ۱۴ سیرۃ النبی اول ص۲۸۹-۹۱ ۱۵ ابن ہشام اول ص ۲۴۱-۲۵۲، سید مودودی، سیرتِ سرورِ عالم، دوم ص ۱۵۵-۶۱ نیز ابن ہشام میں حبشہ کے مہاجرین کرام کی فہرست بھی ملاحظہ ہو: اول ص ۳۲۱-۳۱، بلاذری اول ص ۱۹۸-۲۲۷ وغیرہ دوسرے مصادر بر موضوع ہجرت حبشہ ۱۶ ابن ہشام و سید مودودی کے علاوہ خاکسار کی کتاب عہد نبوی میں تنظیم ریاست و حکومت کا باب دوم اور مسلم آبادی و تعداد بر

مذکورہ بالا مضمون ملاحظہ ہو جو زیادہ تفصیلات فراہم کرتے ہیں [۱۸] دینی برادروں کے خاندانی اور قبائلی تعلق کے لیے ملاحظہ ہو: ابن سعد، ابن عبدالبر کی الاستیعاب، ابن اثیر اور ابن حجر کی الاصابہ میں ان کے سوانحی خاکے [۱۹] حضرات شیخین کے باہمی توافق و اتحاد کے بہت سے شواہد ہیں جو کتب حدیث میں باب الفضائل اور تذکرہ و سیرت و تاریخ کے مختلف ابواب میں ملتے ہیں

[۱۹] ملاحظہ ہو ابن سعد، سوم ص ۹-۸، ہشتم ص ۴۸ اور ابن اثیر، دوم ص ۲۶، ص ۳۶-۲۳۳، پنجم ص ۲۰۰

[۲۰] ابن سعد، سوم ص ۶۵-۶۱، ص ۱۲۶، ص ۳۶-۱۳۳، اسد الغابہ (ابن اثیر) ص ۱۷-۳۱۵، چہارم ص ۳۶-۱۳۳

[۲۱] ابن سعد، سوم ص ۱۰۲ و مابعد و ص ۲۱۴ و مابعد، اسد الغابہ، دوم ص ۹۹-۱۹۶، سوم ص ۵۹ و مابعد۔

مصر کے ممتاز ادیب ۔ زکی مبارک

از جناب صفدر سلطان اصلاحی علی گڑھ

زکی مبارک کے آباء و اجداد کا تعلق مصر کے ایک گاؤں سنتریس سے تھا[۱] یہ گاؤں قاہرہ کے قرب و جوار میں واقع ہے۔ ان کے والد محمد عبدالسلام مبارک کاشتکار تھے۔ جو تقویٰ، خدا ترسی، مہمان نوازی اور استغنا کے اوصاف سے متصف تھے۔ ان کا خاندان گاؤں کا ممتاز اور با اثر خاندان تصور کیا جاتا تھا[۲] زکی مبارک کو اپنے والد سے بڑی محبت تھی۔ ۱۹۳۵ء میں ان کا انتقال ہوا تو وہ بہت غم زدہ ہوئے، زکی مبارک اپنے والد کی شرافت، صاف گوئی، ثبات، عزیمت اور سنجیدگی سے بے حد متاثر تھے[۳]

پیدائش زکی مبارک کی تاریخ پیدائش کا تعین قطعی طور سے نہیں کیا جاسکتا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں انہوں نے اپنے دیوان مسمیٰ بألوان الخلود کے مقدمہ میں اپنی عمر کے پچپن سال ہونے کا ذکر کیا ہے۔ اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ وہ ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے[۴]

تعلیم زکی مبارک کی ابتدائی تعلیم گاؤں کے ایک مکتب میں ہوئی، اس میں قرآن مجید حفظ کیا اور عربی زبان کے مبادی کی تحصیل کی۔ ۱۹۱۰ء میں وہ قاہرہ کی مشہور دینی درسگاہ "الازہر" میں داخل ہوئے۔ عربی ادب اور خاص طور سے شاعری سے ان کو شغف تھا اس لیے

---

[۱] الاعلام خیر الدین زرکلی ۳/۸۴ [۲] الہلال، طہ راوی مارچ ۱۹۶۳ء ص ۱۱، [۳] زکی مبارک، انور الجندی ص ۹

[۴] ایضاً ص ۹

ازہر میں انہوں نے اس پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ ازہر میں قیام کے دوران وہ اساتذہ جن سے یہ بہت زیادہ متاثر ہوئے ان میں سید المرصفی اور محمد المہدی کے نام سر فہرست ہیں[۱]۔ سید المرصفی سے سات سال اور محمد المہدی سے چار سال شرف تلمذ کا موقع ملا۔ انہوں نے ان دونوں اساتذہ کے احسانات کا واضح اعتراف کئی جگہ کیا ہے اور ہر جگہ ان کی مدح و ستائش کی ہے۔ دونوں اساتذہ بھی ان کی صلاحیتوں کے معترف تھے۔ زکی مبارک کو شعر گوئی کا صحیح مذاق بھی ان ہی حضرات کے فیض صحبت کا نتیجہ ہے، انہی کی صحبت میں اطناب اور قصائد میں مبالغہ آرائی کے بجائے اختصار و جامعیت کے خوگر ہوئے[۲]۔

ازہر کے قیام کے دوران ہی خطابت، صحافت اور شاعری کے میدانوں میں وہ اپنے جوہر دکھانے لگے تھے۔ ۱۹۱۵ء میں ازہر کے سکریٹری شیخ محمد حسین عدوی نے طلبہ کے اندر شعر گوئی اور انشاپردازی کا مذاق پیدا کرنے کے لیے ایک ادبی انجمن کی داغ بیل ڈالی جس میں زکی مبارک نہ صرف شامل ہوئے بلکہ بہت جلد وہ تمام طلبہ میں اس حیثیت سے بہت نمایاں اور ممتاز ہو گئے۔ خطابت اور شعر گوئی کے متعدد انعامی مقابلوں میں انہوں نے پہلا انعام حاصل کیا[۳]۔

صحافت سے شغف کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ۱۹۱۱ء میں "الفتی الازہری" (ازہری نوجوان) کے نام سے ان کے متعدد مقالات اور مضامین مختلف اخبارات و رسائل کی زینت بن چکے تھے[۴]۔

ازہر میں طالب علمی کے دوران ہی ان کا تعلق جامعہ مصریہ سے جو آج کل قاہرہ یونیورسٹی کے نام سے مشہور ہے قائم ہو چکا تھا۔ فرانسیسی زبان سیکھنے کی تمنا اور آرزو کو لے کر وہ یونیورسٹی سے متعلق ہوئے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے شام میں کھلنے والے بعض مدارس سے بھی

---

[۱] اعلام النثر والشعر فی العصر الحدیث، محمد یوسف کوکن، ص ۱۳۶۔ [۲] زکی مبارک، انور الجندی ص ۱۳۔
[۳] مقدمہ دیوان زکی مبارک، ص ۱۰ [۴] زکی مبارک، انور الجندی، ص ۲۰۔

ربط قائم کر رکھا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں وہ جامعہ مصریہ سے باقاعدہ اور رسمی طور سے متعلق ہو گئے[۱] اور یہ تعلق برابر گہرا اور مضبوط ہوتا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں انہوں نے اس یونیورسٹی سے فلسفہ اور ادب میں B. A کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے امتحان میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ان کو دو بار ناکام کیا لیکن تیسری بار یہ کامیابی سے ہمکنار ہو گئے۔

مصری یونیورسٹی سے تعلق کے بعد انہوں نے ڈاکٹر احمد ضیف کی نگرانی میں "حب ابن ربیعۃ وشعرہ" کے عنوان سے مشقی لیکچر دینا شروع کیا تو ان کی بڑی پذیرائی ہوئی کیونکہ اس زمانے میں عورتوں سے محبت و الفت کا اظہار یا ان سے متعلق کسی نوعیت کی بھی گفتگو بہت معیوب سمجھی جاتی تھی خصوصاً جب کہ وہ کسی عمامہ پوش اور ازہر کے فارغ التحصیل کی زبان سے ہو[۲]۔ زکی مبارک شہرت و ناموری کے دلدادہ تھے اس لیے ازہر کے نظم و ضبط اور طریقہ تدریس پر تنقید کر کے انہوں نے اچھا خاصا ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ جس میں ان کو بڑی شہرت حاصل ہوئی تھی[۳]۔ وہ طٰہٰ حسین کے نقش قدم پر گامزن تھے[۴]۔

بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد انہوں نے "الاخلاق عند الغزالی" کے موضوع پر اپنا مقالہ لکھنا شروع کیا جس کی تکمیل کے بعد ۱۵ مئی ۱۹۲۴ء کو اس پر مناقشہ ہوا اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری تفویض کی گئی[۵]۔ اس مقالہ میں انہوں نے غزالی پر تنقید و اعتراض کیا تھا اس کی وجہ سے وہ علمی دنیا میں موضوع بحث بن گئے۔

قید و بند جامعہ مصریہ سے ربط و تعلق کے بعد بھی ازہر سے وہ مکمل قطع تعلق نہیں کر سکے تھے۔

---

[۱] مقدمہ دیوان زکی مبارک، ص ۱۳ [۲] اعلام النثر والشعر فی العصر العربی الحدیث، یوسف کوکن ص ۱۳۶
[۳] ایضاً ص ۱۳۰ [۴] الاعلام الالف، انور الجندی، ص ۱۲۹ [۵] الہلال، طٰہٰ وادی، مارچ ۱۹۶۳ء ص ۱۲۔

ازہر کے علماء و شیوخ سے استفادہ، وہاں کی علمی و ادبی مجالس میں شرکت اور وہاں کے افکار و خیالات کی تائید و توثیق کا عمل برابر جاری رہا۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء کے انقلاب میں وہ ازہر کے علماء کے ساتھ سرگرم عمل رہے[1]۔ ان کو فرانسیسی زبان اور عربی زبان پر قدرت ہوگئی تھی اس کی وجہ سے وہ اس انقلاب کے دوران کافی مشہور ہوئے۔ شیخ محمد ابو العونی اور عبد اللطیف دراز کی طرح وہ بھی اس انقلاب کے نمایاں مقررین میں تھے۔ انقلاب کے دوران ہی ایک غیر ملکی وفد نے ازہر کا معائنہ کیا۔ اس وفد کے سامنے انہوں نے فرانسیسی زبان میں جو فصیح و بلیغ تقریر کی۔ اس پر سامعین کو بہت تعجب ہوا۔ انقلاب میں بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے پیش نظر انہیں حوالۂ زنداں کر دیا گیا۔ جہاں یہ مہینوں قید و بند کی صعوبتوں اور پریشانیوں کو برداشت کرتے رہے[2]۔ انہوں نے جیل کی زندگی کے واقعات کو خود قلم بند کیا ہے۔ جیل سے انہوں نے اپنے بعض ساتھیوں کو خطوط بھی لکھے۔ انیس مخائل کے نام ان کے بعض خطوط ان کی کتاب "البدائع" میں چھپ گئے ہیں[3]۔

جامعہ مصریہ سے ربط ان کی صحافتی صلاحیتوں کو نشو و نما دینے کا وسیلہ بھی بنا۔ ۱۹۲۱ء میں وہ "الحزب الوطنی" کے صحیفہ "الافکار" کے مدیر بنائے گئے۔ مکمل اخبار کی ترتیب و تدوین ان ہی کے ذمہ تھی۔ انہوں نے صحافت میں جرأت، صراحت اور بے لوث تنقید کو اپنا شعار بنایا لیکن "الافکار" کے منتظمین اور "الحزب الوطنی" کے بعض قائدین کی طرف سے کچھ بیجا پابندیوں اور بندشوں کی وجہ سے یہ بہت جلد اس سے علیحدہ ہوگئے[4]۔ بعد میں عبد القادر حمزہ نے ۱۹۲۳ء میں ان سے البلاغ کی مجلس ادارت میں شمولیت کی درخواست کی لیکن یہ اسے قبول نہیں کر سکے۔ الافکار کے اکثر مضامین میں انہوں نے مصری معاشرت

---

۱ اعلام النثر والشعر، ص ۱۳۰ ۲ ایضاً ۳ زکی مبارک انور الجندی، ص ۱۸ ۴ ایضاً، ص ۲۰۔

انگریزی سامراج اور ازہر کے تعلیمی نظام پر تنقید کی ہے[1]۔

۱۹۲۵ء میں زکی مبارک کا تقرر جامعہ مصریہ میں معاون لکچرر کی حیثیت سے ہوگیا۔ اس دوران وہ فرانسیسی مستشرق مسٹر کازونوفا کی ترجمانی کا فریضہ بھی انجام دیتے رہے۔ تدریس کے ساتھ وہ شعبۂ قانون کے طلبہ کے سامنے "کتاب مغنی اللبیب" کے مباحث کی وضاحت بھی کرتے تھے[2]۔

حصولِ تعلیم کے لیے فرانس جانا

زکی مبارک نے بڑی حوصلہ مند طبیعت پائی تھی اس لیے بلندیوں پر پہنچ جانے کے لیے نہایت بے چین اور بے قرار رہتے تھے۔ چنانچہ جامعہ مصریہ سے بھی بہت جلد علیحدگی اختیار کر کے انہوں نے معیاری اور اعلیٰ تعلیم کی غرض سے پیرس جانے کا عزم کیا۔ انہوں نے فرانس کا یہ سفر مصر کے مشہور ادیبوں کی تقلید و اتباع میں اختیار کیا تھا۔ حکومت کی طرف سے کوئی تعاون نہ ملنے اور مالی دشواریوں کے باوجود وہ ۱۹۲۶ء میں فرانس کے لیے روانہ ہوگئے[3]۔ "البلاغ" میں شایع ہونے والے مقالات کی کم اجرت ہی سے وہ اپنے خاندان کی کفالت کرتے تھے اور یہی فرانس میں ان کے تعلیمی اخراجات کا ذریعہ بھی تھی۔ ابتدا میں وہ موسم سرما مصر میں گزارتے تھے اور موسم گرما فرانس میں۔ مصر میں قیام کا اہم مقصد اخراجات اور ضروریاتِ زندگی کی تکمیل تھا آخری سالوں میں یہ علم کے لیے بالکل یکسو ہوگئے۔ بڑے سخت اور مشکل حالات میں انہوں نے چوتھی صدی ہجری میں "فن نثر" (النثر الفنی فی القرن الرابع) کے عنوان سے فرانسیسی زبان میں ایک مبسوط مقالہ تیار کیا[4]۔ ۲۵ اپریل ۱۹۳۱ء کو اس پر مناقشہ ہوا[5]۔ اس مقالہ میں بعض فرانسیسی ادیبوں اور دانشوروں پر سخت تنقید کی گئی تھی جس کی وجہ سے اس پر بڑی رد و کد ہوئی تاہم اسکی

---

۱ زکی مبارک، انور الجندی، ص ۱۱ ۲ اعلام النثر والشعر فی العصر الحدیث، محمد یوسف کوکن، ص ۱۳۸ ۳ مقدمہ دیوان زکی مبارک، ص ۱۴ ۴ الاعلام لائف، انور الجندی، ص ۱۲۵ ۵ مقدمہ زکی مبارک، ص ۱۴۔

اہمیت کے پیش نظر انہیں اس پر ڈاکٹریٹ (P.H.D) کی ڈگری عطا کی گئی[1] اس طرح غیر ملکی یونیورسٹی سے کسی سند کے حصول کی ان کی تمنا اور آرزو پوری ہوگئی[2]

جامعہ مصریہ میں دوبارہ تقرر اور اس سے معزولی

سنہ ۱۹۳۱ء میں فرانس سے واپسی ہوئی، سنہ ۱۹۳۳ء میں طہٰ حسین یونیورسٹی سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اسی عرصہ میں جامعہ مصریہ میں دوسری بار ان کا تقرر ہوگیا[3] لیکن سنہ ۱۹۳۴ء میں جب طہٰ حسین اپنے عہدے پر واپس ہوئے تو انہوں نے ان کے نئے تقرر کو اس لیے مسترد کردیا کہ اس کے بارے میں ان سے کوئی مشورہ نہیں کیا گیا تھا[4]۔ طہٰ حسین کی اس مبتذل حرکت اور معاندانہ اقدام پر ان کے بعض قریبی دوستوں نے بھی ناپسندیدگی کا اظہار کیا جن میں المازنی پیش پیش تھے۔ دراصل زکی مبارک نے اپنی کتاب "النثر الفنی" میں جس طرح کھل کر تنقید کی تھی اور بعد میں بھی اس سلسلے کو جاری رکھا تھا اس سے طہٰ حسین کی انا کو کافی ٹھیس پہنچی تھی اور وہ انتقام پر کمربستہ ہوگئے تھے۔ طہٰ حسین کی اس انتقامی کارروائی پر استاذ سلامہ موسیٰ نے سخت نکیر کا اظہار کیا اس وقت انہوں نے یہ کہا تھا:-

"زکی مبارک کے احسانات کا اس شکل میں بدلہ دیے جانے پر کہ ان کا ذریعۂ معاش ہی ختم کردیا گیا ہم کو سخت شرمندگی ہے، بلاشبہ اس سے ان کے بجائے خود یونیورسٹی کو زیادہ نقصان پہنچا۔ یہ اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے قاہرہ کے کسی بھی امریکی یا فرانسیسی اسکول میں بہترین زندگی گزار سکتے ہیں"[5]

[1] زکی مبارک، انور الجندی، ص ۳۳ [2] اعلام النثر والشعر، یوسف کوکن، ص ۱۳۸ [3] فی الحیاۃ والادب، فاضل خلف، ص ۱۰۵ [4] اعلام النثر والشعر، یوسف کوکن، ص ۱۳۸ [5] اعلام النثر والشعر فی العصر الحدیث، محمد یوسف کوکن، ص ۱۳۸-۱۳۹۔

زکی مبارک نے خود اپنے ساتھ اس جنگ آمیز معاملے پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جامعہ مصریہ سے میں حصول معاش کے لیے وابستہ نہیں ہوا تھا، میرا اصل مقصد طلبہ میں ادب کا صحیح مذاق پیدا کرنا تھا۔ میرے رفقاء میری اس آرزو کے گواہ ہیں"[1]

یونیورسٹی سے علیحدگی کے بعد انہوں نے کچھ دنوں امریکی یونیورسٹی میں تدریسی خدمات انجام دیں لیکن یہ سلسلہ بعض اسباب کی وجہ سے بہت جلد منقطع ہوگیا۔

مقالہ نگاری کا دور

سنہ ۱۹۲۷ء سے لے کر سنہ ۱۹۳۸ء تک کا زمانہ بڑی اہمیت کا حامل ہے اسی دور میں "البلاغ" "الرسالہ" اور "المصری" میں ان کے اہم ادبی، تنقیدی اور علمی مقالات شائع ہوئے۔ جن پر پورے مصر میں ہنگامہ بھی رہا تاہم ان کی بدولت تمام ادبی حلقوں کی توجہ ان کی طرف منعطف ہوگئی اور وہ بہت جلد ایک ادیب اور تنقید نگار کی حیثیت سے معروف و مشہور ہوگئے۔ البلاغ میں ہر ہفتہ ان کے تنقیدی اور ادبی مضامین "الحدیث ذو شجون" کے عنوان سے شائع ہوتے تھے[2] جن میں ادب و نقد کے علاوہ لغت اور بلاغت کے مباحث بھی ہوتے تھے۔ ان مضامین کو بڑی توجہ سے پڑھا جاتا تھا۔

صحافت کی یہ مشغولیتیں ان کے علمی و تحقیقی مشاغل کے لیے مانع نہیں ہوئیں۔ اس دوران وہ ڈاکٹریٹ کی تیسری ڈگری حاصل کرنے کی تیاری میں بھی منہمک رہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۶ء میں "التصوف الاسلامی" کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ جامعہ مصریہ میں داخل کیا[3] اس پر ڈگری تفویض کرنے کے لیے جو کمیٹی بنائی گئی تھی اس میں ڈاکٹر طہٰ حسین کا نام بھی تھا۔ لیکن انہوں نے معذرت کی اور ان کی جگہ استاذ محمد شفیق غربال کا نام تجویز ہوا۔ کمیٹی نے

[1] اعلام النثر والشعر فی العصر الحدیث، محمد یوسف کوکن، ص ۱۳۹ [2] الاعلام، خیر الدین زرکلی ۳/۷،۴۴ والمحافظۃ والتجدید فی النثر العربی الحدیث، انور الجندی، ص ۴۴۴ [3] رواد خالدون، محمد بن شریف، ص ۹۶۔

کافی بحث و مباحثہ کے بعد ڈگری تفویض کیے جانے کی سفارش کی۔ اس بار مناقشے کے سامعین میں احمد جاد المولی بھی تھے۔ جو اس سے پہلے "الاخلاق عند الغزالی" پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری دینے کے لیے وضع کی گئی کمیٹی کے ممبر بھی تھے۔ انھوں نے اس بار زکی مبارک میں بڑا تغیر اور تبدیلی محسوس کی، جس کی وضاحت انھوں نے تفصیل سے کی ہے[1]۔

حکومت کے محکمہ تعلیم سے وابستگی وعلحدگی ادب اور صحافت کے میدان میں ان کی نمایاں صلاحیت اور بڑھتی ہوئی مقبولیت کو دیکھ کر حکومت نے ان کو ذمہ داری تفویض کرنے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء میں ان کو وزارت تعلیم کے محکمہ میں غیر ملکی مدارس کا ذمہ دار مقرر کیا۔ اس وقت ان کی عمر ۴۳ سال تھی۔ انھوں نے کافی محنت، جانفشانی اور عزم و حوصلہ سے اپنی ذمہ داری کو انجام دیا۔ لیکن حکومت پر بے باکانہ تنقید اور اس کے وزراء کی غلطیوں پر کھلے عام اظہار نکیر کی وجہ سے انہیں بہت جلد اس سے الگ کر دیا گیا[2]۔

بغداد کے دار المعلمین العلیاء میں تدریسی خدمات ۱۹۳۷ء میں زکی مبارک کسی کام سے پیرس کے سفر کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ حکومت عراق نے انہیں بغداد میں دار المعلمین العلیاء میں تدریسی خدمات کی انجام دہی کے لیے مدعو کیا[3]۔ ابتدا میں انھوں نے پس و پیش کیا، لیکن بعد میں اسے قبول کرلیا اور فلسطین، شام اور لبنان کے خشکی کے راستے بغداد کا سفر کیا، صرف بغداد اور دمشق کے درمیان کار کے ذریعہ صحرا کے سفر میں پچیس ۲۵ گھنٹے لگے[4]۔

بغداد میں ان کا قیام ادبی لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ادب کے مختلف موضوعات پر انھوں نے ہزاروں صفحات سیاہ کیے۔ ان کی کتابیں "لیلی المریضۃ فی العراق"، "وحی بغداد"

[1] مقدمہ التصوف الاسلامی، زکی مبارک، ص ۳ [2] اعلام النثر والشعر، ص ۱۳۹ [3] الہلال مارچ ۱۹۶۳ء ص ۱۲ [4] اعلام النثر والشعر، ص ۱۴۳۔

"ملامح المجتمع العراقی" اور "عبقریۃ الشریف الرضی" اسی زمانہ قیام کی یادگار ہیں[5]۔

زکی مبارک نے عراق میں قیام کے دوران اس کے مشہور شہروں، بصرہ، نجف، کوفہ، حیرہ اور موصل وغیرہ کی زیارت کی اور وہاں کے ادباء و شعراء سے ملے۔ اس طرح بہت جلد ان کی شہرت تمام ادبی و شعری حلقوں میں پھیل گئی۔ عراقی صحافت نے بھی ان کے افکار و خیالات کو عراق اور اس کے گرد و پیش کے عرب ممالک میں پھیلا دیا، اس کی وجہ سے ہر طرف ان کے افکار کا چرچا ہونے لگا[1]۔

زکی مبارک "دار المعلمین العلیاء" کے ہونہار طلبہ میں ادبی و علمی موضوعات پر جدید تحقیقی انداز سے لکھنے پڑھنے اور مطالعہ کرنے کا ذوق پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اسی غرض سے انھوں نے یہاں تدریسی ذمہ داری سنبھالی تھی۔ انھوں نے اپنے اس مقصد پر پوری توجہ دی اور ان کا خیال تھا کہ کسی حد تک وہ اس مقصد میں کامیاب بھی ہوئے[2]۔

(باقی)

[5] الہلال ۱۹۶۳ء ص ۱۲ [1] اعلام النثر، کوکن ص ۱۴۳ [2] ایضاً

معارف کی ڈاک

مکتوب لاہور

سمن آباد۔ لاہور

۲۷ دسمبر ۹۷ء

برادر محترم! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

استاذ گرامی مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ کی وفات حسرت آیات کی اطلاع آپ کو مل چکی ہوگی۔ ہم سب تلامذہ وعقیدت مندوں کے لیے یہ سانحہ بے حد صدمہ کا باعث ہے لیکن مرحوم اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ ین۔ کے لیے بالعموم اور کتاب الٰہی کے لیے بالخصوص جس طرح استعمال کر گئے اور تفسیر لکھ کر جس طرح زندگی جاوید پا گئے اس میں ہم سب کے لیے بڑا سبق ہے۔

جن لوگوں کو کم یا زیادہ مولانا کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع ملا ہے ان کے پاس یقیناً اسکی یادداشت محفوظ ہوگی اور اگر خط وکتابت کا موقع ملا ہے تو مولانا کے علمی مکتوب شاید سنبھالے ہوئے ہوں۔ رسالہ تدبر کی ایک اشاعت اس طرح کے تاثرات، مکاتیب اور مولانا کی علمی خدمات کے لیے خاص کرنے کا ارادہ ہے۔ آپ کی طرف میری نگاہ اٹھتی ہے۔ اس سلسلہ میں مولانا کی یاد میں کچھ وقت صرف کرکے اپنی یادداشتوں کو مرتب کرکے بھیجیں تاکہ قارئین کے سامنے مولانا کی شخصیت کے تمام پہلو آسکیں۔ آخر فروری تک آپ کی طرف سے تحریر یا مکاتیب پہنچ جائیں تو عنایت ہوگی۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

والسلام: خالد مسعود

مکتوب سدھارت نگر

ڈومریا گنج، سدھارت نگر

۳۰ر دسمبر ۱۹۹۷ء

مخدوم ومحترم! حفظکم اللہ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی مع الخیر ہوگا، اس وقت رات کے سناٹے میں جب یہ خط تحریر کر رہا ہوں تو ۹۷ء جہاں اپنا رخت سفر باندھ رہا ہے وہیں ۱۹۹۸ء کی نئی صبح کے طلوع کے ساتھ رحمتوں کا بابرکت مہینہ بھی جلوہ فگن ہو رہا ہے، مگر ۹۷ء جاتے جاتے بہت سے حادثات وسیاسی انقلابات کے ساتھ ہم سے برصغیر کی ایک نہایت قیمتی متاع وگرانمایہ علمی شخصیت وممتاز داعی دین مولانا امین احسن اصلاحی کو لے کر رخصت ہوا، یہ اندوہناک خبر ۱۸ر دسمبر کے قومی آواز کے ذریعہ تاخیر سے ملی، دراصل میں انہیں دنوں میں دہلی علی گڑھ، لکھنؤ کے سفر پر تھا، ہفتہ بعد قومی آواز پہ نظر پڑی تو دل دھک سے ہوگیا، مولانا مرحوم تقسیم اراضی کے لحاظ سے گو لاہور (پاکستان) میں سکونت پذیر تھے مگر وہ برصغیر کے اہم علمی ستون اور مشترکہ میراث تھے، تفسیر قرآن انکا خاص موضوع تھا، ذات پاک سے دعا ہے کہ ان کو اپنی خاص رحمتوں سے نوازے اور اعلیٰ علیین میں جگہ دے، چونکہ موصوف سے آپ کے گوناگوں تعلقات تھے، قدیم نسبتیں تھیں، اس لیے ان سطور کے ذریعہ ہم آپ سے دلی تعزیت کا اظہار کرتے ہیں اور متعلقین وورثین کے لیے صبر وسلوان کی دعا بھی۔

معارف دسمبر ۹۷ء موصول ہوگیا ہے، اداریہ مسلم جذبات کا ترجمان ہے، اس کے ساتھ بی جے پی کی اردو کشی، تمام اسکولوں میں سنسکرت کو لازمی قرار دینا اور وندے ماترم کا ترانہ پڑھنے کا اعلان، یہ وہ اقدام ہے جس سے اردو کا قصہ ختم کرنے کے ساتھ اسلامی عقائد پر کاری ضرب پڑتی ہے نیز بھاجپا کے اقتدار میں بنے رہنے اور مسلمانوں کو بہلانے کی سازش کی طرف بروقت اشارہ ہی نہیں بلکہ واضح نشاندہی کی ہے، اس خیال اور آواز کو زیادہ

سے زیادہ عام کرنا چاہیے، کثیر الاشاعت اخباروں کو اس اداریہ کو نقل کرنا چاہیے۔ کوشش کریں گے کہ ہم بھی اپنے قلیل الاشاعت مجلہ میں اسے نقل کر سکیں۔

۲۔ خدا خدا کرکے مجلہ الفرقان کی پہلی جلد مکمل ہوگئی۔ دیکھنے میں سال بھر کا عرصہ اور چھ شمارے ہیں، لیکن اس کے لیے کتنے ہفت خوان طے کرنے پڑے ہیں، کچھ آپ سے مخفی نہیں، خوشی اس بات کی ہے کہ آپ جیسے مستند اہل قلم کی قلمی و علمی معاونت سے بہت جلد علمی حلقوں میں سند اعتبار و اعتماد حاصل ہوگیا فللّٰہ الحمد۔ مزید آپ کے قلمی تعاون کی سخت ضرورت ہے۔ اس پر معارف کے تبصرے کا شدید انتظار ہے۔

والسلام

عبدالمبین ندوی

وفیات

مولانا امین احسن اصلاحیؒ

از

ضیاء الدین اصلاحی

۱۶ دسمبر ۱۹۹۷ء کو جامعۃ الفلاح بلریا گنج میں یہ اندوہ ناک خبر سنی کہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی وفات ہوگئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

ادھر سال بھر سے اس کا کھٹکا لگا ہوا تھا کہ علم و کمال کا یہ مہر جہاں تاب غروب ہونے والا ہے۔ اور قرآن و حدیث کے بحر کا شناور اور غواص، علامہ حمید الدین فراہیؒ کا جانشین و ترجمان، ان کے علوم و معارف کا وارث و امین، حکمت قرآنی کا شارح و مبین دین حق کا داعی و مبلغ، اسرار دین کا عارف و آشنا، شرک و توحید اور تقویٰ و نماز کا رمز د حقیقت شناس اپنے ہزاروں شاگردوں اور قدر دانوں کو مغموم، اداس اور سوگوار چھوڑ کر جلد ہی سفر آخرت پر روانہ ہونے والا ہے۔

ابھی مولانا بدر الدین اصلاحی ناظم مدرسۃ الاصلاح و دائرۂ حمیدیہ کا غم تازہ ہی تھا کہ مدرسہ کا یہ گل سرسبد اور ذکر حمید کا سب سے بڑا حامل و شیدائی بھی رخصت ہوگیا

کیا کہوں تاریکیٔ زندانِ غم اندھیر ہے   پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب اعظم گڑھ شہر سے پورب میں واقع ایک گاؤں 'بمہور' کے متوسط زمیندار گھرانے میں ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے

والد حافظ محمد مرتضیٰ صاحب ایک دیندار، متبع سنت اور تہجد گزار شخص تھے۔ وہ اپنے فرزند کو دینی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ اپنی اس تمنا کا ذکر انھوں نے اپنے ہم وطن دوست مولانا شبلی متکلم ندوی سے کیا جو علامہ شبلیؒ کے عزیز شاگرد اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے منصب اہتمام پر فائز تھے۔ انھوں نے اسی مدرسہ میں مولانا امین احسن صاحب کا داخلہ کرادیا جہاں انھوں نے ان سے اور دوسرے اساتذہ سے دینی علوم کی تحصیل کی۔ ان کو اپنی طالب علمی کے زمانے میں سب سے زیادہ فیض مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی سے پہونچا۔

مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی بڑے لائق و فاضل تھے۔ علامہ شبلی نے انھیں جوہر قابل سمجھ کر ان کی تربیت سے بڑی دلچسپی لی۔ وہ اپنے ساتھ انھیں بعض جلسوں میں لے جاتے۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے دوسرے سالانہ اجلاس میں بھی جو ۱۹۱۰ء میں ہوا تھا، علامہ ان کو اپنے ہمراہ لائے۔ وہ اس وقت بہت کم عمر تھے۔ ایک بچہ کی زبان سے ایسے اچھے خیالات اور ایسی سنجیدہ تقریر سن کر لوگ حیرت میں پڑ گئے۔ یہی تقریر ندوہ سے فراغت کے بعد سرائے میر میں ان کے آنے کی تقریب بن گئی، اور یہیں سے ان کی تدریسی زندگی کا آغاز ہوا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

"تعلیم سے فارغ ہوکر مرحوم (مولانا نگرامی) بھی وابستگان شبلی کی جماعت میں داخل ہوگئے اور چار برس تک مدرسہ سرائے میر میں رہ کر درس و تدریس کا فرض انجام دیا۔ اور مدرسہ میں زیر تربیت چند اچھے لڑکے پیدا کیے۔ جن میں سے ایک آج مولانا امین احسن کے نام سے مشہور ہیں۔" (یاد رفتگاں)

یہاں کے قیام کے زمانے میں انھوں نے مولانا حمیدالدین فراہیؒ کے زیر سایہ قرآن پاک کا فیض حاصل کیا۔ اور مشرقی اضلاع میں ان کی اصلاحی تقریریں بھی مقبول ہو رہی تھیں۔ مگر جب

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے جامع مسجد کلکتہ میں مدرسہ اسلامیہ قائم کیا تو ان کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے۔ اس کے بند ہو جانے پر ۱۹۲۳ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ادب و تفسیر کے استاذ ہوکر آئے۔ لیکن جلد ہی علالت کا سلسلہ شروع ہوگیا اور ۱۹۲۶ء میں عین شباب میں وفات ہوگئی۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کو مولانا نگرامیؒ سے ایسا والہانہ تعلق تھا کہ 'سچ' اخبار سے وابستگی کے زمانے میں وہ امین آباد سے روزانہ پیدل چل کر ندوہ ان سے ملنے آجایا کرتے تھے۔ اس اخبار سے پہلے وہ 'مدینہ' بجنور کے بھی ایڈیٹر رہے۔ مگر جلد ہی صحافت کا کوچہ چھوڑ دیا اور مدرسۃ الاصلاح کی کشش ان کو سرائے میر کھینچ لائی جس کے بوریائے فقر پر اس وقت ترجمان القرآن مولانا حمیدالدین فراہیؒ فروکش ہوکر وہاں کے اساتذہ کو اپنے خاص نہج پر قرآن مجید کی تعلیم دے رہے تھے۔ ان کے درس سے وہ اور ان کے ہم سبق مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم نے پورا استفادہ کیا۔ ان دونوں کا شوق و رغبت اور استعداد و قابلیت دیکھ کر مولانا فراہیؒ نے بھی ان کو اپنی توجہ و عنایت کا خاص مورد بنایا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ رقمطراز ہیں:

"اواخر عمر میں مرحوم (مولانا فراہیؒ) کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ وہ چند مستعد طلبہ کو اپنے مذاق کے مطابق تیار کریں۔ چنانچہ کم از کم دو طالبعلموں کی خاص طور سے انھوں نے دماغی تربیت کی۔"

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے فخر و امتیاز کے لیے یہ کافی ہے کہ انھیں مولانا فراہیؒ کی جانشینی کا شرف حاصل ہوا۔ اور وہی ان کے سب سے ممتاز شاگرد کی حیثیت سے مشہور ہوئے جس کا حق بھی انھوں نے خاطر خواہ طور پر ادا کیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا بیان ہے کہ "بعض مستعد طلبہ نے مولانا فراہیؒ کے اس درس سے پورا فائدہ اٹھایا جن میں قابل ذکر مولوی امین احسن صاحب اصلاحی ہیں۔ ہماری آئندہ توقعات ان سے بہت کچھ وابستہ ہے۔" اپنے استاذ کا نام روشن کرنے اور ان کے افکار و نظریات کی اشاعت و ترجمانی کو انھوں نے

اپنی زندگی کا مشن بنالیا۔ جب کسی جانب سے مولانا فراہیؒ پر کوئی اعتراض ہوتا تو وہ ان کی حمایت کے لیے سینہ سپر ہوجاتے۔ ان کے اس قسم کے مضامین 'الاصلاح' اور 'معارف' دونوں میں چھپے ہیں۔ ایک زمانے میں ان کے استاذ علامہ فراہیؒ اور استاذ الاستاذ علامہ شبلیؒ کے خلاف غوغائے تکفیر بپا ہوا تو وہی ان مظلوم "امامین ہمامین" کی مدافعت اور ان کی یادگار مدرسۃ الاصلاح کو شر پسندوں سے بچانے کے لیے یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے ؎

بیا ورید گر ایں جا بود سخنداں غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

مولانا امین احسن اصلاحیؒ قرآنیات اور عربی زبان وادب ہی کے متبحر عالم نہ تھے، بلکہ اکثر دینی اور جدید علوم پر بھی ان کی اچھی اور مجتہدانہ نظر تھی۔ اپنے استاذ علامہ فراہی سے قرآن مجید، ادب عربی اور نحو وبلاغت کے علاوہ فلسفۂ جدیدہ کی بھی تحصیل کی تھی۔ ان کے والد بزرگوار سلفی المسلک اور مولانا عبدالرحمن مبارکپوری صاحب تحفۃ الاحوذی کے عقیدتمند اور ان کی علمی مجلسوں کے حاضر باش تھے۔ والد کی خواہش پر مولانا اصلاحی نے فن حدیث کی امہات کتب از سر نو ان سے پڑھیں اور اس میں بڑا کمال حاصل کیا۔ وہ اپنے جن استاذوں کا اکثر تذکرہ کرتے اور جن کے وہ بہت ممنون احسان تھے ان میں مولانا فراہیؒ اور مولانا نگرامیؒ کے ساتھ مولانا مبارکپوری کا نام بھی لیتے۔

مولانا فراہیؒ کے انتقال کے بعد ان کے افکار وتصانیف کی اشاعت کے لیے مولانا امین احسن اصلاحی کی سربراہی میں دائرۂ حمیدیہ قائم ہوا جس نے مولانا کی عربی تصانیف کے متون اور ان کے سلیس وشگفتہ اردو ترجمے شائع کیے۔ یہ ترجمے مولانا اصلاحی نے اتنی خوبی اور قابلیت سے کیے ہیں کہ ان پر اصل کا دھوکا ہوتا ہے۔ دائرۂ حمیدیہ کی طرف سے ان کی ادارت میں ایک بلند پایہ علمی ماہنامہ "الاصلاح" بھی جاری ہوا۔ مگر ناقدری کی بنا پر

یہ چار برس ہی میں بند ہوگیا۔ تاہم اس میں قرآنیات پر ایسے محققانہ مضامین شائع ہوئے کہ آج تک لب ساقی پہ یہ مکرر صدا جاری ہے ع

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

جس زمانے میں وہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں درس وتدریس کی خدمت پر مامور رہ کر مولانا فراہیؒ کی تصنیفات کی ترتیب واشاعت اور اپنی بعض کتابوں کی تحریر وتسوید میں مشغول تھے اسی زمانے میں ماہنامہ ترجمان القرآن کے دعوتی وانقلابی مضامین اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی موثر ودلنشین متکلمانہ تحریروں کا غلغلہ بلند ہوا جن سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے علاوہ وہ علماء بھی متاثر ہوئے جو وقت کے تقاضوں اور زمانے کے حالات سے کسی قدر باخبر تھے۔ لیکن مولانا امین احسن اصلاحی نے شروع میں ان کا کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ کیونکہ ان پر اس وقت تک اپنے استاذ مولانا عبدالرحمن نگرامیؒ کے زیر اثر ترک موالات اور تحریک خلافت اور مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے سیاسی خیالات کا اثر تھا۔ اس کے علاوہ وہ خود جس فکر کے حامل تھے اس کے اپنے خاص تقاضے اور مطالبے تھے۔ اس کے ساتھ دوسرے افکار اور تحریکوں کا میل نہیں ہوسکتا تھا۔ اسی لیے غالباً وہ اس سے قریب نہیں ہوسکے۔ مولانا مودودی کی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" پر 'الاصلاح' کے کئی نمبروں میں تنقید لکھی۔

جب مولانا مودودیؒ نے اپنے خیالات کی اشاعت اور اپنا حلقہ اثر بڑھانے کے لیے بعض جگہوں کا سفر کیا تو وہ سرائے میر بھی تشریف لائے اور بالآخر فکر حمید کے سب سے بڑے داعی وشارح بھی ان کے مکمل ہم نوا ہوگئے۔ اور وہ وقت بھی آپہونچا کہ استاد کا آستانہ چھوڑ کر پٹھان کوٹ جو اس زمانے میں مولانا مودودیؒ کا مرکز

مستقر تھا، جا پہونچے۔ جب مدرسۃ الاصلاح کے حدود سے وہ باہر نکل رہے ہوں گے تو کارکنانِ قضا و قدر نے یہ صدا ضرور بلند کی ہوگی کہ "تیری شان ان مشاغل سے بالاتر ہے"

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو   تو کجا بہرِ تماشا می روی

مگر ایسے جوش کے عالم میں ہوش کی باتوں پر کون کان دھرتا ہے۔ جلد ہی انھوں نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے مولانا مودودیؒ کے بعد جماعت میں اپنی سب سے اہم اور نمایاں جگہ بنالی۔ ترجمان القرآن پر نام تو مولانا مودودیؒ کا ہوتا تھا لیکن عملاً وہی اس کے مدیر ہوگئے تھے۔ اسی لیے جب ملک تقسیم ہوا تو جماعت کا نظام سنبھالنے اور اس کی امارت و سربراہی کا بار اٹھانے کے لیے مولانا مودودیؒ نے انھیں ہندوستان بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے بہر حال مدرسۃ الاصلاح میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن تقسیم کے بعد ایسی قیامت بپا ہوئی اور فسادات کی آگ اتنی سخت بھڑک اٹھی کہ جو جہاں تھا وہیں دم بخود رہ گیا۔ مولانا امین احسن صاحبؒ بھی لاہور سے سرائے میر کے خرابے میں چراغِ آرزو جلانے تشریف نہیں لاسکے۔

پاکستان بننے کے بعد وہاں جماعت کی طرف سے اسلامی نظام کا مطالبہ بڑے زور وشور سے بلند ہوا۔ اس کی وجہ سے مولانا مودودی، مولانا اصلاحی اور دوسرے سرکردہ قائدین کو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ پھر انتخابات کا مرحلہ آیا۔ جس میں جماعت نے پوری سرگرمی سے حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو مولانا اصلاحی اور انکے بعض رفقاء نے محسوس کیا کہ اب جماعت کی ساری توجہ حصولِ اقتدار کی جانب مرکوز ہوگئی ہے اور وہ اصلاح و دعوت اور افراد سازی کے اپنے اصل موقف سے منحرف ہوگئی ہے۔ بہر حال یہ اور اسی طرح کے بعض دوسرے اختلافات کی بنا پر وہ اس جماعت سے علٰحدہ ہوگئے جس کے

برسوں سے سب سے اہم اور برتر رکن تھے اور جس کے لیے اپنی ساری قوت و توانائی اور ذہنی و دماغی قابلیت وصلاحیت صرف کردی تھی۔

جماعت سے علٰحدگی کے بعد مولانا امین احسن صاحب نے حلقۂ تدبر قرآن قائم کیا جس کی اطلاع جب ان کے بعض قدیم کرم فرماؤں مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا عبدالماجد دریابادی وغیرہ کو ہوئی تو انھوں نے اس پر بڑی مسرت ظاہر کی۔ اس کے زیر اہتمام انھوں نے بعض ذی استعداد طلبہ اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو قرآن مجید واحادیث نبویؐ کا درس دینا شروع کیا۔ اور اپنے خیالات ومقاصد کے اظہار واشاعت کے لیے رسالہ 'میثاق' جاری کیا۔ بعد میں اس رسالے پر ان کے ایک شاگرد ڈاکٹر اسرار احمد قابض ہوگئے۔

جماعت سے الگ ہونے پر انھیں یک سوئی میسر ہوگئی تھی اس لیے وہ اپنے اصل اور بنیادی کام کی طرف متوجہ ہوئے اور قرآن مجید کی جس میں برسوں سے غور وخوض ان کی زندگی کا سب سے محبوب مشغلہ تھا، تفسیر "تدبر قرآن" کے نام سے لکھنی شروع کی جو 'میثاق' میں بالاقساط شائع ہوئی اور پھر نو جلدوں میں کتابی صورت میں چھپی۔ اردو میں یہ اپنی نوعیت کی منفرد تفسیر تھی اس لیے بہت مقبول ہوئی۔ پاکستان میں اس کے کئی ایڈیشن نکلے۔ اور ہندوستان میں بھی یہ تاج کمپنی دہلی سے چھپ گئی ہے اور ہر جگہ دستیاب ہے۔

مولانا حمید الدین فراہیؒ نے اواخر قرآن کی بعض مختصر سورتوں کی تفسیر لکھی تھی۔ باقی سورتوں کے متعلق کچھ نوٹ اور متفرق اشارات ہی لکھ سکے تھے۔ ضرورت تھی اور ان کے مولانا فراہیؒ کے قدر دانوں کا اصرار بھی تھا کہ ان کے اصول ومتعینہ خطوط کے مطابق مکمل قرآن مجید کی تفسیر لکھی جائے۔ ظاہر ہے یہ کام مولانا کے تلامذہ میں ان کے علاوہ کوئی اور نہیں کرسکتا تھا۔ انھوں نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے کیا جو واقعتہً ان کا بڑا کارنامہ

اور ع ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند کے مصداق ہے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی تحریر فرماتے ہیں:

"ہمارے فاضل دوست مولانا امین احسن صاحب اصلاحی ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔ تفسیر کے درس و تعلیم میں انھوں نے تمام تر ان ہی سے استفادہ اور برسوں خود بھی اس پر غور و فکر کیا ہے۔ اس لیے ان کو تفسیر لکھنے کا حق تھا اور حق یہ ہے کہ انھوں نے اس کا پورا حق ادا کیا ہے۔ اور بڑی دقت و وسعت نظر اور ایمانی جذبہ سے یہ تفسیر لکھی گئی ہے جو ان کی برسوں کی محنت اور غور و فکر کا نتیجہ اور ہر حیثیت سے جامع و مکمل ہے ..... اور مصنف کا بڑا کارنامہ ہے۔ اس سے اردو تفسیر کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ ہوا اور وہ ہر پڑھے لکھے مسلمان کے مطالعہ کے لائق ہے۔" (معارف عدد ۳ جلد ۱۰۴۔ ستمبر ۱۹۶۹ء)

یہ صحیح ہے کہ 'تدبر قرآن' میں مولانا فراہیؒ کے اصول تفسیر مدنظر رکھے گئے ہیں اور اس میں ان کے افکار و خیالات سے مکمل استفادہ بھی کیا گیا ہے۔ اسی لیے اسے فراہی اسکول کی مستند تفسیر کا درجہ حاصل ہوگیا ہے۔ مگر اصلاً یہ مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی ہی محنت و جانفشانی، برسوں کے مطالعہ و تحقیق اور مسلسل غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اور اس میں کہیں کہیں انھوں نے صراحۃً اپنے استاذ سے اختلاف بھی کیا ہے۔

'میثاق' کے بعد ان کی نگرانی اور ان کے خاص فیض یافتہ جناب خالد مسعود صاحب کی ادارت میں رسالہ 'تدبر' نکلا جو ابھی تک نکل رہا ہے۔ مولانا اپنی تفسیر 'تدبر قرآن' مکمل کر چکے تو 'تدبر حدیث' کی تکمیل میں لگ گئے۔ موطأ امام مالک اور صحیح بخاری کی حدیثوں کی شرح و ترجمانی سے متعلق حصے رسالہ 'تدبر' میں برابر شائع ہو رہے ہیں۔

تدبر حدیث کا یہ سلسلہ بھی مولانا کے زریں کارناموں میں ہے۔

جو لوگ تقلید پر قانع اور قدماء کی روش پر چلنے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں اور فنون و علوم اسلامیہ کے معروضی اور غیر جانبدارانہ مطالعہ کے عادی نہیں ہیں، یا جو لوگ اپنے مزعومہ متفقہ عقائد و خیالات کے خلاف نہ کوئی سنجیدہ اور معقول بات سننے کو تیار ہوتے ہیں اور نہ اپنے حلقوں کے سوا کسی اور حلقہ کی کوئی بات اپنے کانوں میں پڑنے دینا چاہتے ہیں، ان کے لیے مولانا کی تفسیر، تشریح احادیث اور بعض تصنیفات کے کچھ مقامات نامانوس اور ناقابل قبول ہو سکتے ہیں۔ اس طرح کے لوگوں نے اس قسم کے بعض مسائل کو لے کر حسب عادت شور و غوغا بھی مچایا۔ مگر مولانا اجماع عام کے ان کے دعوے سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ اپنے اس خیال کو پوری جرأت کے ساتھ پیش کرتے رہے جسے وہ صحیح اور کتاب و سنت کے مطابق سمجھتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی جیسے بلند پایہ محقق، وسیع النظر عالم اور قرآن و حدیث کے ماہر سے جمہور کے تمام خیالات و آرا کی پابندی کا مطالبہ کرنا اور نہ کرنے پر سب و شتم اور تکفیر و تضلیل کا محاذ گرم کر دینا بڑی زیادتی اور انتہائی تنگ نظری ہے۔ ہر دور کے نابغۂ روزگار علماء کے یہاں مجتہدانہ خیالات اور تفردات ملتے ہیں۔ ان کی بنا پر انھیں مطعون کرنا اور ان پر کفر و زندقہ کا الزام عائد کرنا علمی کم مائیگی اور عدم تدبر کا نتیجہ ہے۔ متقدمین اور دور حاضر میں بھی ایسے متعدد علماء گزرے ہیں جن کی سطح اپنے معاصرین سے بلند تھی اس لیے وہ اپنے عہد کے مزعومات اور تقلیدی رجحانات کا ساتھ نہیں دے سکے۔ اس لیے ابنائے زمانہ کے طعن و تشنیع کا نشانہ بنے۔ حالانکہ ایسے موقع پر بے صبری اور عجلت کے بجائے توقف و تامل اہل حق اور اصحاب علم کا شیوہ رہا ہے۔

مولانا امین احسن صاحب کی رگ و پے میں علامہ شبلی کی صہبائے علم و ادب رقص کر رہی تھی. اور وہ ان کے طرز تحریر کو اردو انشا پردازی کا اعلیٰ ترین نمونہ سمجھتے تھے. ان کی تحریروں کی رعنائی، دلکشی اور دلآویزی کا یہی سبب ہے. لیکن اب ان کی پختگی اور مشاقی سے ان کا اپنا الگ اور جداگانہ رنگ و آہنگ بھی ہوگیا تھا. جس میں سادگی کے باوجود پُرکاری ہوتی تھی. طبقۂ علماء میں ایسی صاف، شستہ، سلیس، شگفتہ اور رواں اردو لکھنے والے کم ملیں گے. ان کو عربی لکھنے پر بھی قدرت تھی. 'الضیاء' (لکھنؤ) میں ان کے بعض عربی مضامین شائع ہوئے.

مولانا کی علمی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا تھا اور تصنیفی زندگی کی بسم اللہ کلمہ لاالٰہ الا اللہ کی تشریح سے ہوئی. پہلے حقیقت شرک لکھی. پھر حقیقت توحید. باقی تصنیفات کے نام یہ ہیں: حقیقتِ نماز. حقیقت تقویٰ. اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل. تدوینِ قانونِ اسلامی. تزکیۂ نفس. دعوتِ دین اور اس کا طریقۂ کار. قرآن میں پردے کے احکام. مبادی تدبر قرآن. مبادی تدبر حدیث. مولانا حمید الدین فراہیؒ. اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام. عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ. فلسفے کے بنیادی مسائل قرآن حکیم کی روشنی میں. تفہیمِ دین. مقالات اصلاحی (جلد اول)

ان مستقل تصنیفات کے علاوہ مولانا فراہیؒ کی متعدد تصنیفات و رسائل کا اردو ترجمہ کیا. آخر میں تدبر قرآن کی نو جلدیں لکھیں اور تدبر حدیث پر کام کر رہے تھے کہ پیامِ اجل آگیا. ع خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا.

مولاناؒ نے بڑی مشغول علمی زندگی گزاری. انھوں نے طویل عمر پائی جو درس و تدریس، تصنیف و تالیف، اشاعتِ علم اور خدمتِ دین کے لیے وقف رہی. مدرسۃ الاصلاح میں

درس و تدریس کا جو مشغلہ شروع کیا تھا وہ کسی نہ کسی شکل میں تا عمر جاری رہا.

مجھے ان سے ملاقات کا شرف صرف ایک بار اس وقت حاصل ہوا جب وہ اپنے والد کی علالت کی خبر سن کر ۱۹۵۲ء میں ہندوستان اپنے آبائی وطن تشریف لائے تھے. مگر ان کے پہونچنے سے پہلے ہی ان کے والد کا انتقال ہوچکا تھا. اس وقت دونوں ملکوں کے تعلقات بہت کشیدہ تھے. پھر ان کا تعلق جس جماعت سے تھا اس کی وجہ سے انھیں گاؤں سے کہیں باہر جانے کی اجازت نہیں تھی. میں ان سے وہیں ملنے گیا تو بڑے لطف و محبت سے پیش آئے. میرے بڑے بھائی مولوی قمر الدین اصلاحی کے بارے میں دریافت کیا جن کا قلمی و ادبی نام قمر اعظمی ہے اور جن کو انھوں نے پڑھایا تھا. جب بھائی کے بارے میں انھیں معلوم ہوا کہ ان کا مشغلہ علمی نہیں ہے تو انھیں بڑا افسوس ہوا اور میرے ذریعہ سے انھیں یہ پیغام بھیجا کہ آخر ان کے علم، ان کی ذہانت و صلاحیت سے ان کی قوم و ملت اور ملک کو کیا فائدہ پہونچا.

میری موجودگی میں مغرب کے بعد ان سے ملنے کے لیے مولانا قاضی اطہر مبارکپوری اپنے دو تین ساتھیوں کے ساتھ آئے اور عشاء سے پہلے واپس جانے لگے تو مولانا نے فرمایا کہ اس وقت رات میں کیوں جا رہے ہیں؟ قاضی صاحب نے کہا: ہم لوگ قریب کے ہیں. ابھی پہونچ جائیں گے. مولانا نے فرمایا کہ قریب کے لوگوں کو ہی روکا جاتا ہے. قاضی صاحب نے ہنس کر کہا: نہیں! اجازت دیجئے. ہم لوگ بس نیاز حاصل کرنے آئے تھے. مولانا نے فرمایا: اجی حضرت! میں تو خود ہی نیازمند ہوں.

میری ان سے یہی پہلی اور آخری ملاقات تھی. البتہ ان سے کبھی کبھی خط و کتابت رہتی تھی. 'میثاق' کے لیے ان کی طلب پر میں نے چند مضامین لکھے. وہ میرے

عزیز بھی ہو گئے تھے۔ ان کے ایک سگے پوتے عزیزی ابوریحان جو افسوس ہے کہ دادری کے
ہوائی حادثہ میں ۱۲ر نومبر ۱۹۹۶ء کو جاں بحق ہو گئے ان سے میری لڑکی شاہین منسوب تھی۔
میں نے جب اپنی طرف سے اس رشتہ اور مولانا بدر الدین اصلاحی مرحوم کے نکاح پڑھانے
کی انھیں اطلاع دی تو اس پر خوشی ظاہر کرتے ہوئے لکھا کہ تمھارا خط بہت مختصر تھا۔ اب جب
خط لکھو تو دارالمصنفین اور مدرسۃ الاصلاح کا مفصل حال لکھو اور دونوں جگہ میرے جو ملنے
اور جاننے والے لوگ موجود ہیں ان کا ذکر کرو۔ اور ان سے میرا سلام کہو۔ چنانچہ تعمیلِ حکم
میں جب میں نے بڑا مفصل خط لکھا تو بہت خوش ہوئے اور جواب میں تحریر فرمایا کہ دراصل
میں اسی طرح کا خط چاہتا تھا۔ اسی گرامی نامہ میں یہ بھی تحریر فرمایا تھا "میرا جی چاہتا ہے کہ
ایک بار پھر وہاں آؤں۔ چاہے میرے جاننے والے ہوں یا نہ ہوں۔ مدرسۃ الاصلاح کے
در و دیوار تو ہوں گے۔ ان ہی سے لپٹ کر اچھی طرح رو لوں گا"۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں مدرسۃ الاصلاح سے جو ان کے استاذ کی یادگار ہے،
کتنا جذباتی تعلق تھا اور وہ اس کی ترقی و استحکام کے کس قدر آرزومند رہتے تھے۔ وہ پاکستان
میں ضرور تھے۔ لیکن ان کا دل یہاں اور یہاں کے لوگوں میں بھی اٹکا رہتا تھا۔ اور
جب یہاں کے کسی شخص کو پا جاتے تھے تو فرطِ تعلق سے لپٹ جاتے تھے اور جو جو یاد
آتا سب کا حال دریافت فرماتے۔

راقم کے ایک استاذ مولوی قمر الزمان صاحب اصلاحی مرحوم جو مولانا امین احسن صاحبؒ
کے عزیز تھے جس سال حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے اسی سال مولانا اصلاحی بھی
پاکستان سے حج کے لیے آئے ہوئے تھے، وہ ان سے ملنے گئے تو ان کے پاس
کئی ملکوں کے اہم اور معزز اشخاص بیٹھے ہوئے تھے لیکن ان کو دیکھتے ہی باغ باغ ہو گئے

اور ان کی ساری توجہ کا مرکز یہی ہو گئے۔

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم ایک دفعہ ان سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے
تو ان کے اعزاز میں ایک بڑی لمبی اور شاندار دعوت کا اہتمام کیا۔ سید صاحب فرماتے تھے کہ مجھے ایسی
پرتکلف اور شاندار دعوت کھانے کا اتفاق بہت کم ہوا تھا۔ وہ مولانا اصلاحی کے گرم جوشی سے ملنے
اور خلوص و محبت کا اکثر ذکر فرماتے اور کہتے کہ جو لوگ ان کی یہاں موجودگی کے وقت دارالمصنفین
کے کسی شعبہ سے وابستہ تھے ان سب کا نام لے کر ایک ایک شخص کے بارے میں دریافت کرتے رہے
دراصل دارالمصنفین سے بھی ان کو بڑا تعلق تھا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبدالسلام ندوی
سے ملاقات کے لیے یہاں برابر آتے رہتے تھے اور خود سید صاحب بھی سرائمیر برابر تشریف لے جاتے تھے
اور مولانا امین احسن صاحبؒ کی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے۔

مولانا حکیم محمد مختار اصلاحی ان کے عزیز شاگرد ہیں۔ ایک دفعہ ان کے بڑے صاحبزادے
حکیم محمد فیاض صاحب پاکستان گئے اور ان سے ملے تو بڑی پذیرائی کی اور کہنے لگے مجھے بھی اپنے
ساتھ لے چلو۔ اگر کبھی بمبئی کے راستہ سے آیا تو تمھارے یہاں قیام کروں گا اور دہلی سے آنے
پر عبداللطیف اعظمی صاحب کے یہاں قیام کروں گا۔ یہ بھی ان کے چہیتے شاگرد ہیں۔

مولانا امین احسن صاحبؒ کھانے پینے کے جتنے شوقین تھے اس سے زیادہ دوسروں
کو کھلا کر انھیں خوشی ہوتی تھی۔ ان کے یہاں اکثر دعوتیں ہوتی تھیں۔ اعظم گڑھ میں حکیم محمد اسحاق صاحب
اپنی حذاقتِ فن، شرافتِ نفس اور جامع صفاتِ حسنہ ہونے کی بنا پر ہر طبقہ میں بہت مقبول و
محبوب تھے۔ مدرسۃ الاصلاح اور اس کے ذمہ داروں سے بھی ان کے اچھے تعلقات تھے۔
مولانا امین احسن صاحبؒ ان کے بڑے بے تکلف اور خاص دوست تھے۔ حکیم صاحب کے
نورتنوں میں مشہور شاعر جناب یحییٰ اعظمی اور دارالمصنفین کے رفقاء و وابستگان بھی تھے۔

ان سب کو مولانا اصلاحی سال میں دو مرتبہ اپنے دولت خانے پر مدعو کرتے. ایک تو جاڑے میں، جب ہرے مٹر اور گنا تیار ہوتا. اور دوسرے آموں کے موسم میں. حکیم صاحب کا سفر عموماً کشتی سے ہوتا تھا. مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کو بھی ان دعوتوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا تھا۔

مولانا اصلاحیؒ بڑے پرکشش، وجیہ و شکیل، جامہ زیب، بارعب اور نظافت پسند شخص تھے۔ انھیں صفائی بہت پسند تھی. کبھی ان کے جسم پر میلے کچیلے کپڑے نہیں دیکھے گئے. لباس سفید پہنتے تھے جس پر کہیں داغ دھبہ نہیں ہوتا تھا. لباس ہی کی طرح ان کا کمرہ بھی چمکتا اور جگمگاتا رہتا تھا. ان کی پڑھنے لکھنے کی میز بہت مرتب اور صاف ہوتی. ان کی ہر ہر چیز سے حسن، نفاست اور سلیقہ مندی ظاہر ہوتی تھی، اور کہیں سے بد ذوقی اور بے ڈھنگے پن کا پتہ نہیں چلتا تھا

ان میں حد درجہ غیرت، خودداری، استغنا اور بے نیازی تھی. کبھی کسی کا احسان مند ہونا گوارا نہیں کرتے تھے۔ وہ جس پایہ اور رتبہ کے شخص تھے، چاہتے تو ہر بڑا عہدہ اور اعزاز ان کو مل سکتا تھا. لیکن ان کے نزدیک ان چیزوں کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی. ان کا قیام رحمٰن پورہ میں تھا جس کی حیثیت ایک گاؤں جیسی تھی. صدر ضیاء الحق مرحوم نے بہت چاہا کہ ان کے لیے لاہور یا جس بڑے شہر میں وہ پسند کریں ایک اچھا مکان تعمیر کرا دیں. مگر وہ اس کے لیے کسی طرح آمادہ نہیں ہوئے

وہ عام لوگوں سے بڑی تواضع اور انکسار سے پیش آتے تھے لیکن امراء اور ذی جاہ و حشمت اشخاص سے کبھی جھک کر نہیں ملے۔ طبیعت شاہانہ پائی تھی. ہمیشہ اچھی اور قیمتی چیزیں استعمال کرتے تھے. کوئی ادنیٰ اور معمولی چیز انکی نگاہ میں جچتی ہی نہیں تھی. ہمیشہ سکنڈ اور فرسٹ کلاس میں سفر کرتے. تانگے پر اکیلے سوار ہوتے. کشادہ دست تھے، پس انداز کرنے کی کبھی عادت نہیں رہی. جو پاس ہوتا بے دریغ خرچ کر ڈالتے. سائل کو اپنی حیثیت سے زیادہ دیتے تھے. حرص و ہوس کا کوئی شائبہ بھی انہیں نہیں تھا.

اللہ تعالیٰ نے ان کو جن اعلیٰ و برتر مقاصد کے لیے پیدا کیا تھا انھی میں شب و روز

منہمک رہتے. گھر گرہستی کے کاموں سے کوئی سروکار نہ رکھتے. ان کی ضرورتوں کا سامان ان کے عزیز اور احباب مہیا کرتے تھے جن سے کہا کرتے کہ انتم اعلم بامور دنیاکم۔

جب کسی پر غصہ آتا اور بہت برہم ہو جاتے تو بعض اوقات کچھ سخت سست اور ناگفتنی بھی کہہ جاتے لیکن جلد ہی ان کا غصہ فرو ہو جاتا. کسی سے کینہ کدورت نہ رکھتے۔

مولانا امین احسنؒ اصلاحی کو تحریر ہی کی طرح تقریر کا بھی خداداد ملکہ تھا. ان کا یہ جوہر طالب علمی ہی کے زمانے میں کھل گیا تھا. مولانا عبد الرحمٰن نگرامی کی صحبت میں اسے مزید ترقی ہوئی. وہ خلافت اور مولانا مدنی کے ساتھ جمعیۃ کے جلسوں میں شریک ہوتے اور اپنی جادو بیانی کا سکہ جما دیتے. بعض ثقہ شاہدین نے مجھے بتایا کہ ان کی تقریروں کے سامنے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی تقریریں پھیکی ہو جاتی تھیں. جماعت اسلامی سے وابستہ ہوئے تو اس حلقہ کے سب سے بڑے مقرر وہی تھے. وہ کئی کئی گھنٹے تک بولتے مگر تسلسل اور حسن بیان میں فرق نہیں آتا. وہ بدیہۃً الفاظ کے توکل سربسد تھے ہی حق یہ ہے کہ پورے برصغیر میں اس پایہ کے عالم، خطیب اور مصنف کم ہی لوگ ہوں گے. ان کی کتابوں کی تعداد بعض مصنفین کے مولفات و رسائل کی طرح چاہے سینکڑوں نہ ہوں لیکن جن لوگوں کی کمیت کے بجائے کیفیت پر بھی نظر رہتی ہے وہ یہی کہیں گے ؎

بغاث الطیر اکثرھا فراخا　　　وام الصقر مقلاۃ نزور

مولانا امین احسن اصلاحی کی موت علم و دین کا بڑا خسارہ ہے جس کی تلافی کا بظاہر امکان نہیں ہے. ان کے بعض تلامذہ خصوصاً جناب خالد مسعود صاحب سے ہماری بڑی توقعات وابستہ ہیں. ان سے گزارش ہے کہ مولانا نے جو مشن برپا کیا تھا اسے جاری رکھیں۔

اللہ تعالیٰ علم و دین کے اس خادم کی مغفرت فرمائے اور عزیزوں اور اہل تعلق کو صبر جمیل مرحمت فرمائے

اللھم صبب علیہ شآبیب رحمتك وبرّد مضجعه واجعل الجنة مثواہ.

پروفیسر خلیق احمد نظامی کی یاد میں

از پروفیسر اصغر عباس، علی گڑھ

"نظامی صاحب بلند پایہ عالم اور ملک کے ممتاز مورخ اور دارالمصنفین کے رکن رکین تھے، ان پر بعض مشہور اہل قلم سے جن کو ان سے گہری واقفیت تھی، مضمون لکھنے کی فرمائش کی گئی ہے، اس مضمون میں ان کی زندگی کے ایک خاص پہلو ہی سے گفتگو کی گئی ہے"۔ (ض)

خلیق احمد نظامی صاحب کے نام نامی سے میں علی گڑھ آنے سے پہلے ہی واقف ہو چکا تھا لیکن ملاقات ۱۹۶۰ء میں ہوئی جب راقم الحروف سرسید ہال کا طالب علم تھا اور وہ اس کے پرووسٹ مقرر ہوئے تھے۔

نظامی صاحب متوسط قد کے تھے لیکن ان کا جسم ایسا تھا کہ ہر لباس خواہ ہندوستانی ہو یا انگریزی ان پر خوب پھبتا تھا۔ ان کا رنگ گندمی تھا جس کی وجہ سے ان کے سفید بال کی جو قدرے لمبائی لیے ہوئے تھے سپیدی کا احساس بڑھ جاتا تھا۔ ان کی آنکھیں بڑی نہیں تھیں لیکن نہایت روشن تھیں جن میں ایک خاص چمک تھی، ان کے چہرے سے رعب عیاں ہوتا تھا لیکن خوف بالکل نہیں معلوم ہوتا تھا۔

نظامی صاحب مجسم علم تو تھے ہی لیکن ان کے سراپا عمل ہونے کا عقدہ اس وقت کھلا جب انہوں نے پہلی بار یونیورسٹی میں انتظامی عہدہ سنبھالا اور سرسید ہال میں پرووسٹ ہو کر آئے ان کے زمانے میں ہال نے بڑی ترقی کی۔ میں اس کا عینی شاہد ہوں کہ وہ ہال کے دفتر میں

حساب کا ایک ایک رجسٹر دیکھتے، مددگاروں کو انتظامات کی ایک ایک جزئی باتیں سمجھاتے نہیں راستہ بھی دکھاتے اور ایک ایک کام کی تاکید بھی کرتے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہال کے در و دیوار سے لے کر اس کے سبزہ زار تک سب سرسبز اور شاداب ہو گئے۔ دراصل ہال کی ہمہ جہت ترقی کا راز ان کی تحلیلی اور تخیلی فکر میں تو تھا ہی سونے پر سہاگہ ان کا گہرا ہوا ذوق نفاست تھا جس کی وجہ سے ہال کی ہر شے چمک گئی۔ یہ ہال کا سنہرا زمانہ تھا، ان کا خیال تھا کہ اقامتی ہال کے سربراہ کو صرف وقتی مسائل کو نپٹانے اور ہال کا خزانہ معمور کرنے ہی کا خیال نہیں رکھنا چاہیے بلکہ اسے اولین ترجیح ہال کی علمی اور زندگی سے معمور فضا اور طلبہ کی ذہنی اور علمی نشوونما پر دینی چاہیے، وہ کہتے کہ بیشتر ذی استعداد اور ہونہار نوجوان مناسب اور معقول رہنمائی نہ ملنے سے مایوسی اور بے زاری کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ ہال سے طلبہ کا رشتہ استوار کرتے اور بتاتے کہ اس ہال کے تم کسی گوشے میں چلے جاؤ تاریخ تمہیں زندہ حقیقت معلوم ہوگی یہ ہال تاریخی کارناموں اور یادوں سے لبریز ہے، اس ہال کے مکینوں نے ماضی اور حال کے درمیان ایک پل بنا دیا تھا اور اسی ہال کے رہنے والوں نے ایک نئی مشرقیت کی طرح بھی ڈالی تھی وہ اکثر دوران گفتگو نظیری نیشاپوری کا یہ شعر پڑھتے ؎

صد معنی و جمال دریں گل نہادہ اند   ایں کعبہ را بنا نہ بباطل نہادہ اند

شعر پڑھتے ہوئے ان پر ایک کیفیت طاری ہو جاتی اور ان کی آنکھوں میں چمک آجاتی۔ وہ ہال کے طلبہ میں اسکالر پرووسٹ کے نام سے مشہور ہوئے۔

نظامی صاحب سرسید ہال کے طلبہ میں خاصے مقبول تھے، لڑکے ان کی بات ٹالتے نہیں تھے، ان کا احترام کرتے۔ اکثر جب نظامی صاحب ہال میں داخل ہوتے اور طلبہ جس جذبۂ بے اختیار شوق سے ان کا استقبال کرتے وہ مناظر اب تک بھولتے نہیں۔ طلبہ

ان کے اثرات کا اندازہ اس سے کیجئے کہ جب ایس۔ کے۔ بھٹناگر جو غالب کے شاگرد منشی ہرگوپال تفتہ کے خاندان سے تھے اور مشہور سائنسداں شانتی سروپ بھٹناگر کے قریبی عزیزوں میں سے تھے۔ انھوں نے علی گڑھ کالج کی تاریخ لکھی تھی جس میں سرسید کے حسن خیال اور حسن عمل کے ذکر کے علاوہ علی گڑھ کالج کے قیام اور اس کے یونیورسٹی میں تبدیل ہونے کی تاریخ تھی اس کتاب کا مسودہ عرصہ تک ان کے پاس پڑا رہا اور چھپنے کی کوئی سبیل نہ نکلی۔ رشید احمد صدیقی صاحب سے جب یہ بات پروفیسر خلیق احمد نظامی کو معلوم ہوئی تو انھوں نے ہال کے طلبہ سے اس کتاب کی اشاعت کے لیے اپیل کی اور ایک ہفتہ کے اندر سرسید ہال کے طلبہ کے مالی تعاون سے اسکی اشاعت کا سامان مہیا ہوگیا۔

۱۶/ اکتوبر ۱۹۶۸ء کی شام تھی جب سرسید ہال کے لان پر جو حد نگاہ تک یونیورسٹی کے فضلا، اور طلبہ سے بھرا ہوا تھا نظامی صاحب کا لکھا ہوا اور ان کی ہدایت میں ایک شیڈ وپلے ہال کے طلبہ نے پیش کیا تھا۔ جس میں جدید ہندوستان کے معمار سرسید کی فقید المثال تہذیبی خدمات کو بڑے موثر انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ تمثیل بہت مقبول ہوئی بار بار اسے اسٹیج کیا گیا اور بعد میں سرسید ایک تعارف کے عنوان سے شایع ہوئی۔

اس زمانے میں نظامی صاحب صبح و شام اس فکر میں رہتے کہ کون سے وسائل اختیار کیے جائیں جن سے طلبہ میں سائنٹفک انداز فکر اور جستجو کا جذبہ بیدار ہو۔ اسی مقصد کے تحت ۱۹۶۹ء کے یوم آزادی کے موقع پر سائنٹفک سوسائٹی کی تجدید کی گئی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی تحریک کی ناکامی کے بعد جب اندھیرا اور گہرا ہوا تو سرسید نے ۱۸۶۴ء میں سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے ایک چراغ روشن کر دیا۔ یہ ہندوستان میں اپنی نوعیت کی پہلی تنظیم تھی، اس کے مقاصد اور طریق کار ہماری زندگی کا فتح الباب تھے۔ اسی سوسائٹی کے کاموں کے دوران

مجدد قوم نے علی گڑھ تحریک کا خواب دیکھا۔ نظامی صاحب کا خیال تھا کہ سوسائٹی کے پلیٹ فارم پر ہال کے طلبہ آپس میں تبادلہ خیال کریں گے تو فکر و نظر کے نئے نئے سانچے تیار ہوں گے۔

اس زمانے میں ہال میں علمی اور تہذیبی سرگرمیوں کا سلسلہ قائم ہوگیا تھا۔ آئے دن ملک اور بیرون ملک کی اہم علمی اور تہذیبی شخصیتیں آتی رہتی تھیں، یاد آتا ہے کہ خان عبدالغفار خان بھی آئے تھے۔ وہ تقریر کے فن سے تو بے نیاز تھے لیکن ان کی باتوں کا طلبہ نے بہت اثر لیا تھا۔

نظامی صاحب کے زمانے میں ان کی کوششوں سے ہال میں سرسید میموریل لکچر کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلا سرسید یادگاری لکچر جلیل القدر عالم اور مورخ ڈاکٹر تارا چند نے دیا تھا، اس روز اسٹریچی ہال نور سے معمور تھا اور سیاہ شیروانیوں میں ملبوس طلبہ سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ تقریباً سوا گھنٹے تک ڈاکٹر تارا چند اپنا لکچر دیتے رہے اور باوجود اس کے کہ ہم میں سے بہت سے طالب علم ان کی بصیرت افروز باتوں اور مورخانہ ژرف نگاہی کو نہ سمجھے ہوں گے لیکن مجمع بڑا شائستہ تھا اور اب تک ذہن سے محو نہیں ہوتا۔

اسی زمانے میں سرسید سے ان کے فرزندان معنوی کا ذہنی رابطہ قائم کرنے کے لیے نظامی صاحب کا مرتب کردہ رسالہ "سرسید اسپیکس ٹو یو" سرسید ہال کی جانب سے شایع ہوا۔ یہ رسالہ بھی بار بار چھپا۔ جب اسے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے دیکھا تو نظامی صاحب کو لکھا "سرسید کے اہم خیالات کو خود انہیں کے الفاظ میں پیش کرکے آپ نے پڑھنے والوں پر احسان کیا ہے۔ میں اسے بار بار دیکھوں گا۔ نظامی صاحب کے ان کاموں سے طلبہ میں علی گڑھ کے تہذیبی نصب العین سے تعلق خاطر شروع ہوا اور اقبال کی یہ شکایت کہ مسلمانان ایشیا اب تک سرسید کی ذہنی کاوش کو سمجھنے کے قابل نہ ہوسکے ہیں۔" سرسید ہال کے طلبہ کی سطح پر کچھ کم ہونا شروع ہوئی لیکن بعد میں اس سلسلہ کی سطح وہ نہیں رہی جو نظامی صاحب کے دور میں تھی۔

علی گڑھ میں سرسید کی رہایش گاہ انیسویں صدی میں غالباً سب سے زیادہ طوفان آزمودہ عمارت تھی یہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا سمبل بن کر ابھری تھی، علامہ شبلی کی ذہنی تربیت بھی اسی عمارت کے سائے میں ہوئی تھی، وہ ایک عرصے تک اس عمارت کے ایک حصے میں فروکش رہے تھے۔ اقبال کے استاد آرنلڈ علی گڑھ کالج کے پرنسپل تھیوڈور بک انگریزی کے مشہور صاحب قلم سر والٹر ریلے بابائے اردو مولوی عبدالحق، عورتوں کی تعلیم کے سالار کارواں شیخ عبداللہ کے علاوہ نہ جانے اور کس کس کے لیے یہ عمارت بوسہ گاہ بنی ہوئی تھی لیکن زمانے کی بوقلمونی سے یہ عمارت عرصے تک محکمہ کسٹوڈین کے قبضے میں رہی جس کی وجہ سے اس کے در و دیوار شکستہ ہوگئے اور زاغ و زغن کا مسکن بن گئی۔ نظامی صاحب کو اس کی زبوں حالی کا احساس ہوا اور انہوں نے سرسید ہال کی پرووسٹی کے دوران اس عمارت کو از سر نو تعمیر کرنے کا خواب دیکھا، بالآخر ان کی غیر معمولی جد و جہد کے بعد ۱۹۷۱ء میں اتر دیش کے گورنر اور علی گڑھ کے اولڈ بوائے نواب اکبر علی خاں نے اس عمارت کا افتتاح کیا۔ اس عمارت میں سرسید اکیڈمی قائم ہوئی۔ نظامی صاحب اس کے پہلے ڈائریکٹر مقرر ہوئے۔ اس اکیڈمی کے لیے سرسید کے شایان شان ان کے پیش نظر کئی منصوبے تھے۔ انہیں اس کا بڑا ملال تھا کہ اس اکیڈمی کو انہوں نے جہاں چھوڑا تھا اس پر ایک اینٹ کا اضافہ نہ ہو سکا۔

سرسید ہال کے طلبہ سے نظامی صاحب شفقت سے پیش آتے ان کے مطالبات سنتے وہ چاہتے کہ نوجوانوں کی خفتہ صحت مند صلاحیتیں بیدار ہوں اور جب کبھی کوئی ایسی بات دیکھتے جو سرسید ہال کے طلبہ کے شایان شان نہ ہوتیں تو گرم ہو جاتے اور بار بار سرسید کا یہ جملہ دہراتے کہ "جدید تعلیم نے ہمارے نوجوانوں کو گھوڑے کے بجائے خچر بنا دیا ہے"۔ جس درد اور برہمی سے یہ جملہ دہراتے آج بھی ذہن میں یہ جملہ گونج رہا ہے۔

نظامی صاحب کی روزمرہ زندگی میں ایک مشین کی سی باقاعدگی تھی، اسی وجہ سے انہوں نے کم و بیش پچاس کتابیں تصنیف و تالیف اور مرتب کیں تقریباً دو سو سے زاید ان کے مضامین ملک اور بیرون ملک کے وقیع جرائد میں شایع ہوئے ہیں۔ وہ سحر کے وقت بیدار ہو جاتے اور اپنے علمی کاموں میں لگ جاتے اور جب صبح کی ٹھنڈی ہوا اپنے آنے کی خبر دیتی تو وہ لمبی سیر کو نکل جاتے۔ وہ اپنے فرائض منصبی کی ادائگی میں والہانہ انہماک سے کام لیتے۔ انہوں نے شعبۂ تاریخ کے زمانۂ صدارت میں بھی ہمیشہ پہلا پیریڈ لیا۔ علی گڑھ کی پرووائس چانسلری اور وائس چانسلر شپ کے دوران بھی ان کے اس معمول میں فرق نہ آیا۔

نفاست اور لطافت نظامی صاحب کی طبیعت کا لازمی جز تھا۔ ان کا ذاتی کتب خانہ ان کے علمی شوق کے علاوہ ان کے ذوق جمال کا بھی مظہر ہے۔ انہوں نے اپنی لائبریری کو بڑے تکلف سے آراستہ کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے کتب خانے کی ہر کتاب لباس حریر میں ملبوس ہے، اس کے علاوہ خوشنما تاریخی تصویروں، نادر کتابوں، نایاب مخطوطات کا بڑا اچھا ذخیرہ ہے اور پھر ایسے نفیس فانوس اور خوبصورت لیمپ کہ جن پر نگاہ پڑ جائے تو ہٹانے کو جی نہ چاہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اگر ان کا کتب خانہ کوئی عامی بھی دیکھ لے تو اس میں پڑھنے لکھنے کا شوق بیدار ہو جائے۔

نظامی صاحب بنیادی طور پر تاریخ کے عالم تھے اور تاریخ کے حوالے سے ان کی نظر مختلف علوم و فنون پر تھی۔ انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ اردو کے علمی سرمائے کو خاصا مالا مال کیا ہے۔ وہ شعر و ادب کا بھی گہرا ذوق رکھتے تھے۔ اقبال کے مداح تھے کبھی موڈ میں ہوتے تو بہت ڈوب کے ان کے اشعار پڑھتے۔ ان کے کتب خانے میں اقبال پر خاصی کتابیں ہیں جن میں بعض کمیاب ہیں، انہوں نے اقبال کی بعض نادر تحریریں بھی

دریافت کی تھیں، جن کا علم اردو دنیا کو اب تک نہیں ہے۔ ان سب کو شایع کرنے کا ان کا منصوبہ تھا۔

نظامی صاحب کو اچھے کھانے کا شوق تھا۔ وہ خوش خور تھے مگر پُرخور نہیں تھے۔ اکثر ان کے یہاں دعوتوں کا اہتمام ہوتا جس میں الوان نعمت کی نہایت نفاست اور سلیقے کے ساتھ فراوانی ہوتی۔ انہیں یونیورسٹی کے بہت سے اعلیٰ مناصب ملے، وہ شعبۂ تاریخ کے پروفیسر اور صدر رہے، ڈین اسٹوڈینٹ ویلفیر رہے، پرووسٹ رہے، پرووائس چانسلر رہے، وائس چانسلر رہے، سرسید اکیڈمی کے بانی ڈائرکٹر رہے، بعد میں شام میں ہندوستان کے سفیر رہے لیکن جہاں بھی رہے شان سے اور آن بان سے رہے۔

سرسید ہال کے قیام کے زمانہ ہی سے نظامی صاحب راقم الحروف سے بڑی محبت و شفقت سے پیش آتے۔ انہوں نے اپنی بیشتر تصانیف دیں جن پر ان کے دستخط ثبت ہیں۔ ان میں ان کا مرتب کردہ سرسید البم بھی ہے جو خاصا گراں ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ انکی شفقتِ کریمانہ کی شاید یہ وجہ رہی ہو کہ ہم دونوں سرسید کی تاریخ آفریں خدمات اور ان کی سیرت اور شخصیت کا بڑا احترام کرتے۔ میں سرسید ہال کا ان کے زمانے میں ایک جونیر طالب علم تھا سینیر نہیں تھا لیکن اس کے باوجود انہوں نے مجھے اپنی انگریزی کتاب "سید احمد خاں" اردو میں منتقل کرنے کے لیے دیا اور انہیں کی ایما سے اس کتاب کو حکومت ہند نے شایع کیا۔ اس اردو کتاب کے کئی کئی ہزار کے کئی ایڈیشن نکلے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب نے میری زندگی کا رُخ متعین کر دیا۔

پروفیسر خلیق احمد نظامی برصغیر کے سرآمد مورخین میں ہیں۔ ان کے علمی کاموں کی وجہ سے علمی دنیا میں علی گڑھ یونیورسٹی کا نام روشن ہوا۔ ان کے علمی اور تاریخی کارناموں پر تنقید اور

تبصرہ کا یہ موقع نہیں ہے لیکن یہ کہے بغیر بھی نہیں رہا جا سکتا کہ انہوں نے ہندوستان کے دورِ وسطیٰ کی تاریخ کو کھنگالا اور مختلف واقعات اور کوائف سے اس دور کے مزاج اور انداز فکر کو اس طرح مصفا کیا کہ وہ موجودہ دور کے آئینے میں دکھائی دینے لگا۔ دورِ وسطیٰ کی تاریخ کے سلسلے میں انہوں نے خاصا وقیع سرمایہ چھوڑا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر ان کی تحریریں سرمۂ اہل نظر بنی ہوئی ہیں۔

علی گڑھ میں نظامی صاحب کا وسیع و عریض دولت خانہ میرے غریب خانے سے چند قدموں کے فاصلے پر ہے اس لیے اکثر ایسا ہوتا کہ جمعہ کی نماز کے بعد ہم دونوں مسجد سے ساتھ نکلتے اور باتیں کرتے راقم ان کے دولت سرا کے دروازے تک جاتا۔ ۵ر دسمبر جمعہ کا دن تھا میری ملاقات مسجد میں ان سے حسب معمول ہوئی میں ان کے ساتھ ان کے آستانے تک گیا، قدرت نے ان کو توانائی کا جو خزانہ ودیعت کیا تھا وہ اس روز بھی موجود تھا، وہی بلند آہنگی، رفتار میں سرعت، زندگی سے لبریز باتیں کچھ دیر ان کے دروازے پر ہم باتیں کرتے رہے، میں نے ان سے مصافحہ کیا اور رخصت ہوا، شام کو معلوم ہوا کہ یکایک قلب کی حرکت بند ہو جانے سے ان کا انتقال ہو گیا۔ یقین نہیں آیا۔ پھر تیس سال کی ملاقاتوں کی تصویر یکے بعد دیگرے آنے لگیں۔

۶ر دسمبر ۱۹۹۷ء کی شام کو جب سورج لحظہ بہ لحظہ اوٹ میں چھپ رہا تھا اور ماتمی جلوس نظامی صاحب کے جسد خاکی کو آخری آرام گاہ کی طرف لے جا رہا تھا ہزاروں آدمیوں کی دعاؤں کے ساتھ یونیورسٹی کے قبرستان میں انہیں سپرد خاک کر دیا گیا اور اسی کے ساتھ سرسید کا ایک شیدائی، علی گڑھ کی علمی زندگی کی آبرو اور ہندوستان کے دور وسطیٰ کی تاریخ کا آفتاب بھی غروب ہو گیا۔ کل ۱۲ دسمبر اور جمعہ کا روز تھا، میری آنکھیں انہیں مسجد کی صفوں میں تلاش کرتی رہیں۔

پھر نہ آئے جو ہوئے خاک میں جا آسودہ غالباً زیر زمیں میر ہے آرام بہت

مطبوعات جدیدہ

شبلی کا ذہنی ارتقاء

از جناب ڈاکٹر یحییٰ احمد ہاشمی مرحوم، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و طباعت، صفحات ۵۲؛ مجلد مع گرد پوش، قیمت ۳۰۰ روپے، پتہ: مجلس یادگار ہاشمی، جی ۳۴/۵-۶، اسٹیل ٹاؤن، بن قاسم کراچی ۷۵۰۱۰، پاکستان۔

علامہ شبلی پر بہت لکھا جا چکا ہے، یہ نئی کتاب بھی اسی سلسلے کی کڑی اور بڑی مبسوط و مفصل ہے۔ اس میں مملکتِ علم پر علامہ مرحوم کی فرمانروائی کی تاریخ سنہ وار بیان کی گئی ہے، اصلاً یہ تحقیقی مقالہ ہے جو فاضل مولف نے اپنے نامور استاد ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی نگرانی میں لکھا اور جس پر سندھ یونیورسٹی سے ان کو ڈاکٹریٹ کی سند تفویض ہوئی، اس مقالہ کی تیاری کے سلسلہ میں وہ دارالمصنفین بھی تشریف لائے اور یہاں کے مراجع و مآخذ و شخصیات سے انہوں نے استفادہ کیا، کتاب کا نام انہوں نے شاید اپنے استاد محترم کی کتاب 'حالی کے ذہنی ارتقاء' کے تتبع میں رکھا ہے، ورنہ یہ حیاتِ شبلی ہی کا عکس جمیل اور پرتو ہے، مصنف کے بیان کے مطابق اس کتاب کا محرک ایک خواب ہے جس میں مولانا سید سلیمان ندوی نے ان سے فرمائش کی کہ "وہ حیات شبلی کا دوسرا حصہ "تکمیل" مولف مرحوم نے بجا طور پر سید صاحب کے نام انتساب کیا ہے، کتاب ابواب سے خالی ہے جس کی قائم مقامی سنین نے کر دی ہے، اس طرح زیر نظر کتاب میں ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک کے واقعات کو علامہ شبلی کی تصانیف، مضامین، مکاتیب اور دوسرے مستند مآخذ کی مدد سے مرتب کیا گیا ہے اور بعض معتبر ذاتی روایات بھی نقل کی گئی ہیں، اس سلسلے میں علامہ کے عربی شاعری کے ذوق کے متعلق مولانا عبدالماجد دریابادی کے برادر اکبر ڈپٹی عبدالمجید دریابادی کی روایت (ص ۳۱۸) پڑھنے کے

لائق ہے، انہوں نے اپنی تحقیق پر اعتماد کر کے حیات شبلی کے مولف سے جہاں اختلاف کیا ہے، وہاں متانت و شائستگی کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے جیسے ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ مطابق مئی ۱۸۵۸ء میں علامہ شبلی کی ولادت کے متعلق 'حیات شبلی' کے بیان کو انہوں نے "غالباً سہو" تعبیر کرتے ہوئے لکھا کہ صحیح شوال ۱۲۷۳ھ مطابق ۳ جون ۱۸۵۶ء ہے، مولف کا طرز نگارش بھی شستہ و شائستہ ہے، ان کا تعلق اودھ کے ایک ذی علم خاندان سے ہے، ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت میں مولانا دریابادی کی عنایت بھی شامل ہے اور اس کا اثر صاف محسوس ہوتا ہے، کمپیوٹر کی کتابت میں غلطیاں کم ہیں، لیکن واسوخت، عبدالکشور، قند رہا وغیرہ کی اصلاح آیندہ اڈیشن میں ضروری ہے، ص ۹۵ پر سرسید کے ایک خط میں ایک جملہ بھی تصحیح کا متقاضی ہے، شروع میں جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کی موثر تحریر کے علاوہ فاضل مولف کے صاحبزادے سید زبیر احمد ہاشمی کی بھی تحریر ہے، جنھوں نے اپنے والد مرحوم کے اس مقالہ کو شایع کر کے یقیناً سعادتمندی اور خوش بختی کا سامان کیا۔

آئینہ حیرت

از احمد حسین سحر کاکوروی، تصحیح و تعلیق جناب رئیس احمد نعمانی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، صفحات ۸۰، قیمت پچاس روپے، پتہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ۔

فارسی زبان کی ۳۰ شاعرات کے اس مختصر تذکرہ کا ایک قلمی نسخہ ندوۃ العلماء کے کتبخانہ شبلی میں موجود تھا، جسے لائق مرتب نے بڑی کاوش سے مفید اور مستند تعلیقات و تحشیہ سے آراستہ کیا ہے، فارسی زبان کا انکا ذوق طبعی و وہبی ہے اور انکی فارسی شاعری کے مانند زیر نظر کتاب بھی اس کی شاہد ہے، نور جہاں اور زیب النساء پر انکے حواشی تو بجائے خود بہترین مضمون ہیں، ایک شاعرہ زیبائی کا ذکر صرف نام اور ایک شعر کی شکل میں ہے، لیکن ۱۰ سطروں کے حاشیہ سے محنت کا اندازہ ہوتا ہے، اصل نسخہ کی زبان پر بھی گرفت کی گئی ہے جیسے زنانِ شاعرہ کے متعلق لکھا گیا کہ یہ خلافِ محاورہ ہے صحیح زنانِ شاعر ہے۔ یہ مجموعہ فارسی دانوں کے حلقہ میں خصوصیت سے پذیرائی کے لائق ہے۔

علامہ بدرالدین عینی اور علم حدیث میں انکا نقش دوام از شیخ صالح یوسف معتوق، مترجم جناب مولانا عبداللہ کاپودروی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت وطباعت، صفحات ۱۹۲، قیمت ۲۵ روپے، پتہ : مکتبہ سعیدیہ، ترکیسر ضلع سورت گجرات۔

صحیح بخاری کی مشہور و متداول شرح عمدۃ القاری کے شارح علامہ عینیؒ گو محتاج تعارف نہیں لیکن انکے حالات میں ایک جامع کتاب کی ضرورت تھی، زیرِ نظر کتاب سے یہ کمی پوری ہوگئی ہے، اس میں انکے عہد، ذاتی حالات، اساتذہ و تلامذہ و معاصرین کے علاوہ انکی مطبوعہ وغیر مطبوعہ تالیفات کے متعلق محنت و تحقیق سے معلومات یکجا کردیے گئے ہیں، خصوصاً علم حدیث میں انکے مرتبہ بلند اور فتح الباری و عمدۃ القاری کے موازنہ میں طالبان علم حدیث کے لیے مفید معلومات ہیں، اصل کتاب عربی میں بدرالدین عینی و اثرہ فی علم الحدیث کے نام سے تھی۔ اردو داں طبقہ خصوصاً علم حدیث کے طالب علموں کے فائدہ کی غرض سے فاضل مترجم نے اس کو اردو قالب میں منتقل کیا، ترجمہ سلیس [illegible] ہے۔

قمر و معجزہ شق القمر از مولانا عبدالاحد قاسمی تاراپوری، متوسط تقطیع، کاغذ و کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۵۰، قیمت ۶۰ روپے، پتہ کتبخانہ عزیزیہ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶۔

تسخیر قمر کے واقعہ نے جدید سائنس کی اہمیت ثابت کی تو بعض مذہبی واقعات پر از سر نو تدبر و تفکر کی فرصت بھی مہیا کی، زیرِ نظر کتاب میں معجزہ شق القمر کی حقانیت کو سائنسی تحقیقات کی روشنی میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ قدیم و جدید فلاسفہ اور سائنسدانوں کے خیالات، معجزہ شق القمر کی روایات اور اس کے بعض منکرین کے اقوال کا جائزہ لیا گیا ہے، شق القمر کے وقت دنیا کے مختلف علاقوں کے نقشہ اوقات کے علاوہ ہندوستان میں اس کے چشم دید راویوں کی روایات بھی نقل کی گئی ہیں اس موضوع پر اس قدر معلومات یقیناً پہلی بار یکجا کیے گئے ہیں۔

ع۔ ص۔